غیرتِ بہارستان

امیر مینائی

اِدارۂ فروغِ اُردو ◎ لاہور

غیرتِ بہارستان

اِنتخابِ کلام

امیر مینائی

تعداد ——————— ۱۰۰۰
قیمت ——— تین روپے پچاس پیسے

محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور
سے شائع کیا۔

وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر
شعر جو انتخاب ہوتے ہیں

(امیر مینائی)

غیرتِ بہارستان

امیر مینائی

کے اس غیر مطبوعہ دیوان کا نام
جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا

مرتّب

خالد مینائی

از
عبدالماجد دریابادی

تو یہ کہیے کہ آپ امیر مینائی کی غزل گوئی کے قائل نہیں، صرف ان کی فن دانی اور تحقیقِ لغت و زبان کے قائل ہیں۔ اچھا ایک شعر سناتا ہوں۔

"بتائیے کیسا ہے؟"

"اچھا اور بہت اچھا ہے۔"

"اور یہ شعر......."

"یہ بھی خوب ہے، سبحان اللہ۔"

"اچھا اور یہ......"

"اور یہ...... اب کہاں تک سنئے گا۔ یہ سارے شعر امیرؔ ہی کے تھے۔"

ذکر دسمبر کا ہے۔ آگرہ یا اُردو دانوں کے شہر اکبرآباد میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسبِ معمول خوب ٹھٹّے سے ہو رہا ہے، جلسے میں میلے کی دھوم دھام، جشنِ شاہی کا تزک و احتشام، خواص کا مجمع اور عوام کا اژدہام ملک کے گوشے گوشے سے پڑھا لکھا مسلمان کھنچا چلا آ رہا ہے، مہمانوں کے ایک خیمے میں اخیر دسمبر کی ایک ٹھنڈی رات میں دو شخص آس پاس بیٹھے ہوئے وقت گزاری کے لیے شغل اردو شعر و شاعری سے کر رہے ہیں۔ امیرؔ کو داغؔ سے ٹکرا رہے ہیں، ایک کو گرا اور دوسرے کو چڑھا رہے ہیں۔ یہ شعر پر شعر تابڑ توڑ دینے والا ہے۔ سیّد ذی جاہ سلیمان ندوی، ۱۹۵۳ء کا شیخ طریقت نہیں ۱۹۱۳ء کا جوان عمر صاحبِ نظر و صاحبِ قلم، اور سُن سُن کر بلا بیت بازی مات کھا جانے والا ہے۔ ان سطور کا راقم آثم پڑھا نہ لکھا نام محمد فاضل۔ سیّد صاحب سے ربط و ربط ایک مدت سے قائم تھا، ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا، یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا کلام امیر مینائی کا حافظ نکلے گا۔ مرآۃ الغیب کا آئینہ بردار، صنم خانۂ عشق کا پرستار......"

(معارف۔ مئی ۱۹۵۵ء)

حمد

کچھ غم نہیں جو پیش ہے دفتر قصور کا
عنوان نامہ نام ہے ربِّ غفور کا

محروم اس کے خوانِ تجلّی سے کون ہے
حصّہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا

ہمّت ہے شرط، راہِ خدا ہے کھلی ہوئی
پہنچا وہ جس نے قصد کیا راہِ دور کا

کہتے ہی یا کریم اِدھر سے اُدھر گئے
لطف و غضب میں فاصلا تھا کتنی دور کا

وہ صاف دل ہوں مردمکِ چشم کی طرح
میرے سیاہ خانے میں عالم ہے نور کا

عاشق کیا ہے شوق نے تیرے حبیب پہ
یارب امیدوار ہوں عفوِ قصور کا

دیدار کا تو وعدہ وفا ہوگا حشر کو
ارشاد ہو علاج دلِ ناصبور کا

میں خاک بھی ہوا تو ہوا انکی خاکِ در
چھوٹا نہ دستِ عجز سے دامن غرور کا

نعت

چٹک کے کہتا ہے غنچہ غنچہ گلوں سے بڑھ کر بہار تم پر
چہک رہی ہے، چمن میں بلبل ہزار جانیں نثار تم پر
تمہیں خدائی کے بادشاہ ہو، تمھیں تو محبوب کبریا ہو
خدا نے ایسا حسیں بنایا کہ آیا خود اس کو پیار تم پر
نبوت اک بے بہا تھا گہنا، کہ سلسلہ وار سب نے پہنا
تمھیں کیا خاتم النّبیّیں، کھِلا کچھ ایسا یہ ہار تم پر
جلاؤ دوزخ کو کیسا کیسا، بساؤ خلدِ بریں کو کیا کیا
مزہ ہو روزِ جزا، جزا کو جو رکھ دے پروردگار تم پر
ہوئے ہیں یکجا جو حشر کے دن، حسین سب انبیاؑ ہیں لیکن
میں صدقے اپنی نگاہ کے ہوں کہ پڑتی ہے بار بار تم پر

غریب عاشق جو روبرو ہو، قصورِ ترکِ ادب عفو ہو
کہ دیکھ لیتا ہے جب یہ تم کو تو آ ہی جاتا ہے پیار تم پر

تم اور محبّت کا اس سے دعویٰ تمھاری آنکھ اور اس کا جلوہ
امیرؔ تم کو ہُوا ہے سودا، جنوں کا جن ہے سوار تم پر

کیا ہی صابر تھے محمدؐ کے گھرانے والے

گھر خوشی سے رہِ مولا میں لٹانے والے

کیا ہی صابر تھے محمدؐ کے گھرانے والے

بھوک میں، پیاس میں ایک ایک ہزاروں سے لڑا

کیا بہادر تھے محمدؐ کے گھرانے والے

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے
کعبے سے منحرف ہوئے ایماں سے پھر گئے

نصرانیوں نے حضرتِ عیسیٰ سے کی دغا
گویا یہود موسیٰ عمراں سے پھر گئے

ہر چند تھا مقابلہ لاکھوں سے ایک کا
منہ سب کے تیغِ شاہِ شہیداں سے پھر گئے

ثابت قدم جو تھے وہ رہے کربلا میں ساتھ
سست اعتقاد سستیٔ ایماں سے پھر گئے

آسودہ دل ہوا نہ زیارت سے اے امیرؔ
سو بار آئے شوقِ فراواں سے پھر گئے

کیا عجب ہیں بھی شہیدوں میں ہوں محسوب امیرؔ

انس رکھتا ہوں بہت حضرتِ شبیرؑ کے ساتھ

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

امیر احمد نام، امیر تخلص، مینائی نسبتِ خاندانی، متشرع، صوفی اور عالم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے جدِ امجد شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا مزار آج بھی لکھنؤ میں مرجعِ خلائق ہے۔

اکیس ۲۱ سال کی عمر میں علومِ متداولہ ــــ منطق اور فلسفہ، تاریخ، سیر اور جغرافیہ، طب اور علم ہندسہ، ادب اور شعر نیز قرآن و حدیث و فقہ کی تکمیل کی۔ مفتی رہے، منشی کہلائے۔ اُردو کے علاوہ عربی فارسی کے دلدادہ، سنسکرت اور ہندی کے اچھے جاننے والے تھے۔ عربوں سے شستہ عربی میں اور اہلِ ایران سے فارسی میں بے تکلف گفتگو کیا کرتے تھے۔ تحریر تقریر سے بہتر تھی۔ رمل، نجوم اور جفر میں خاصا دخل تھا۔ نیز ہندی موسیقی پر بحیثیت ایک فاضل کے غیر معمولی نظر رکھتے تھے اور ان

سب پر کئی بیش بہا تصانیف یادگار چھوڑ گئے ہیں۔

اردو نثر میں ان کا طرز ٹھیٹ اور دلنشیں ہوتا تھا۔ بالخصوص مکتوبات کہ اس میں ان کا مقام خاص ہے۔ بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، تدبیرالدولہ اسیرؔ کے شاگرد ہوئے، غالبؔ، آتشؔ، ناسخؔ اور انیسؔ کی صحبت اٹھائی۔ ہر صنفِ سخن کو آزمایا اور جلد ہی مشہور ہو گئے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو دیوان نعتیہ ایک ہے۔ عاشقانہ کئی بار بار چھپے۔ فارسی دیوان مکمل ہے۔ لیکن مختصر اور غیر مطبوعہ۔

ان کی تصانیف میں سے تقریباً نصف اردو زبان کے لغات، محاورات نیز دیگر تحقیقات پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ شعر کہنے سے زیادہ انہیں زبان کی چھان بنان کا شوق تھا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ امیراللغات کی داغ بیل امیر مینائی نے اپنی ابتدائی عمر ہی میں ڈال دی تھی اور آخر میں اسے تقریباً مکمل بھی کر لیا تھا لیکن افسوس وہ سرپرستی نصیب نہ ہوئی جو اتنے بڑے کام کی تکمیل و اشاعت کے لیے ضروری ہوتی ہے اور صد حیف کہ ان کی ناگہانی موت کے بعد وہ سارا ذخیرہ تتر بتر ہو گیا جو بڑی تقطیع کے کئی ہزار صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ اب صرف الف مقصورہ و ممدودہ کی جلدیں مطبوعہ اور 'ب' کی غیر مطبوعہ موجود ہیں، باقی کچھ ضائع ہو گیا۔ کچھ دوسرے لغات کی اساس بن گیا۔

امیر مینائی ۱۶ ؍ شعبان ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۷ء کو اودھ کی راج دھانی لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور بعد تکمیل تعلیم وہیں دربار سے متعلق ہو گئے۔ غدر

۱۸۵۷ء کے بعد اپنے استاد بھائی نواب یوسف علی خاں ناظم کے بلانے پر رامپور چلے آئے اور ان کے بے حد اصرار پر رہ پڑے۔ یوسف علیخاں کے بعد کلب علیخاں جو باکمالوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے، ان کے غیر معمولی قدر دان ثابت ہوئے۔ ممالک مغربی وشمالی کے لفٹننٹ گورنر سر ایلفرڈ لائل کے ایما اور کلب علی خاں کی فرمائش پر امیر مینائی نے امیر اللغات کی تکمیل کا بیڑہ اُٹھایا۔ لیکن نواب کی عمر نے وفا نہ کی اور ایلفرڈ لائل جلد ہی انگلستان واپس چلے گئے۔ اب دَور بڑا کٹھن آگیا تھا، امیر مینائی کو بڑھاپے اور بیماری کے باوجود بڑے پاپڑ بیلنا پڑے —— انھوں نے لغت کے فراق میں بہار تک کا سفر کیا۔ بھوپال بھی گئے اور پھر نظام دکن میر محبوب علی خاں کی فرمائش پر ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد آئے۔ مٹی وہیں کی تھی۔ ابھی نظام سے ملے بھی نہ تھے کہ بیمار پڑے اور تقریباً تہتر سال کی عمر میں ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۰۰ء (۱۸-۱۹ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ) کو اتوار کے دن پچھلے پہر انتقال فرمایا۔ احاطۂ یوسف صاحب شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن ہیں۔ لوحِ مزار پر انھیں کا شعر کندہ ہے ؎

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

اللہ بس باقی ہوس

امیر مینائی

اپنے

شعر کے آئینے میں

یہ ایک باب ہے امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کی اُس
سوانحعمری کا جو راقم الحروف نے ترتیب دی ہے اور جس کا
نام ہے ——— "دورِ آخر کا ایک باکمال"

مقصود یہ ہے کہ امیر مینائی کو ان کے اشعار کے آئینے میں آپ دیکھیں بھی، ان سے ملیں بھی، ان کو جانیں بھی، ان کو سنیں بھی اور یہ بھی محسوس کریں کہ مختلف جذبات' نت نئے خیالات کس طرح شاعر کو متأثر کیا کرتے ہیں جو وہ یہ شعر عشق کے متعلق کہتا ہے اور یہ حسن کے' یہاں شوخی سے کام لیتا ہے تو وہاں حسرت و حرماں سے' یہاں افکار پاکیزہ میں کھو گیا ہے تو وہاں افکار ہوس میں، کہیں خفا اور ملول ہے' کہیں شاداں و فرحاں' کہیں جوشیلا اور مست ہے' کہیں کیف بہار میں ڈوبا ہوا، کہیں منظر نگار ہے تو کہیں تصویر ساز،

امیر مینائیؒ انسان ہی تھے کتنے ہی اللہ والے عالم فاضل کیوں نہ رہے ہوں جذبات بھی ان کے انسانوں جیسے تھے' پھر وہ ٹھہرے شاعر اور شاعر کن کن جذبات افکار اور حالات سے متأثر نہیں ہوتا؟

واقعات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے صحیح ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام ایک واقعہ نگار یا مؤرخ کا ہے۔ کسی تصویر یا منظر سے محظوظ ہونے کے لیے پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ کام نقاش یا مصوّر کا ہے۔ اسی طرح شعر سے بھی جو کسی سراپا، کسی منظر، کسی کیفیت' کی ایک تصویر ہی

ہوتا ہے۔ لطف اٹھانے کے لیے اسے ماحول اور تاثر کے مناسب پس منظر کے ساتھ پیش کرنا ازبس ضروری ہے تاکہ اس کے خد و خال ابھر آئیں، برا بھلا کھل جائے اور یہ کام نقّاد کا ہے۔ شاید کچھ لوگ اعتراض کریں لیکن ہے ایسا ہی کیونکہ نقد کے لفظی معنی ہیں پرکھنے کے اور مجازی معنی اچھائیاں، برائیاں، بالکل بے نقاب کر دینے کے۔ نقد ادیب کو عموماً کم بھاتا ہے ——— لیکن دراصل نقد بے لاگ ہو تو مردے جلاتا ہے، ادیب کے افکار میں جان تازہ ڈالتا ہے۔ ناقد کا ذہن تخیلی بھی ہوتا ہے۔ تحلیلی بھی، اس لیے وہ جہاں افکار کے جسم پر سجنے والے لباس کو سراہتا ہے یہی لباس بدزیب، بے ڈھنگا ہو تو اس کے قطع و برید کے مفید مشورے بھی دیتا ہے۔ تیز تنقیدی نظریں بنانے والے ہاتھ کی لغزشوں کو پہچانتی ہیں پھر انھیں سچّی کاٹ کے طریقے بتاتی ہیں تاکہ آئندہ یہ ہاتھ نہ بہکے۔ بعض ادیب خفا ہوتے ہیں اور جل کر کہتے ہیں کہ ناقد کا مقصد تخریب کے سوا کچھ نہیں۔ بفرضِ محال اسے مان بھی لیجیے تو اسے تخریب تعمیری کہنا پڑے گا۔ شاعر ہو یا ادیب بڑا ہی حساس ہوتا ہے اور کمال یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنے اس احساس میں شریک کر لیتا ہے۔ لیکن یہ کام نقّاد ہی کا ہے کہ وہ نگاہوں کو حقیقت شناس بنائے اور ورک بخشے۔ کیا ادیب اور شاعر جن راہوں میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ وہاں نقّاد انھیں نہیں سنبھالتا؟ اس طرح وہ آنے والوں کے لیے راہ ہموار کرتا جاتا ہے۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ نقد کا سچّا اور بلند پایہ ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ بے لطف کوئی چیز نہیں۔

۔۔ سے زیادہ بے لطف کوئی چیز نہیں۔ شعر اچھا ہے یا بُرا اس کا فیصلہ پڑھنے والے اور سننے والے پر بھی ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ہی شعر کبھی لطف دیتا ہے کبھی نہیں، کسی کو لطف دیتا ہے کسی کو نہیں، کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی شعر کے بذاتہٖ اچھے یا بُرے ہونے کے علاوہ وہ پس منظر وہ ماحول بھی ہے جو ایک وقت یا ایک ذہن میں موجود ہوتا ہے دوسرے وقت یا دوسرے ذہن میں نہیں ہوتا۔ انگریزی میں جس چیز کو APP RECIATION سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل طبیعت کے وجدان و فطری نقد ہی کا کرشمہ ہے۔ انسانی جذبات، انسانی افکار و احساسات دل و دماغ ہیں۔ ۔۔ ان تاثرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی ضروری پس منظر لازمی ماحول فراہم کرتے ہیں، ہر اس بات کے لئے جو کہی گئی یا سنی گئی یا ضبطِ تحریر میں لائی گئی۔ اس لئے آئندہ باب کو ایک طرح کی تنقید ہی سمجھنا چاہیئے۔

یہ پس منظر کچھ اس طرح بہم پہنچایا گیا ہے کہ پڑھنے والے پر اشعار کے معنی خود بخود کھلتے جاتے ہیں کسی اور سے پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کہیں اس میں تضاد سے کام لیا گیا ہے کہیں تمثیل سے، اور کہیں خیالات کی اندرونی الجھنوں سے (CONFLICT OF IDEAS)

پڑھے لکھے صاحب کمال کی کئی حیثیتیں ہوتی ہیں۔ بیشک وہ آدمی ہی ہوتا ہے لیکن کہیں آپ اسے انجنیئر پاتے ہیں، کہیں ڈاکٹر، کہیں وکیل پاتے ہیں، کہیں انقلابی سیاسی لیڈر، کہیں مصوّر یا مغنّی، کہیں ادیب یا شاعر، ہو سکتا ہے کہ وہ ڈاکٹر یا بیرسٹر ہوتے ہوئے سیاسی لیڈر بھی ہو، مصوّر ہوتے ہوئے مغنّی بھی ہو، ادیب

ہوتے ہوئے شاعر بھی ہو، وغیرہ۔ زندگی اور وہ بھی انسانوں کی زندگی کوئی سڑک تو ہے نہیں نہ کوئی کپڑے کا تھان جس کے طول و عرض ناپے جا سکیں۔ وہ ایسے لمحات کے بوقلموں مجموعے کا نام ہے۔ جن میں افکار اعمال کے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اور واقعات جنم لیتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے چند واقعات صحیح یا غلط لکھ لئے جاتے ہیں اور اکثر نہیں لکھے جاتے۔

وقت ایک جگہ کھڑا معلوم ہو اگر خیال، عمل روبکار نہ آئیں یہی فطرت کی کرشمہ سازی ہے۔ بڑی چیز خیال ہے اسی کا طوفان ہر شے کو حرکت میں لاتا ہے یہی زندگی کی اصل نشانی ہے۔ عمل کے سارے ہنگامے افکار کے مرہون منت ہیں قیامت خیز ہوں یا بالکل ناقابلِ اعتنا۔ آرٹ میں اس نظریئے کو دیکھئے تصویر جو بنائی گئی یا شعر جو کہا گیا، اولیں طور پر آرٹسٹ کے مرہون منت ہیں۔ فکر و عمل کا ملاپ، پیدائش اور افزائش کا باعث ہوتا ہے ہر لمحہ کسی واقعہ کو جنم دیتا ہے۔ اب لیجیے شاعر کو وہ اپنے کو تلمیذ الرحمٰن سمجھتا ہے اور کہتا ہے:

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

اس کا وجدان اتنا سچا، اس کا تصور اتنا زرخیز ہوتا ہے کہ وہ سینکڑوں واقعات کو تخیل ہی میں پیکر دے کر ان لمحات میں محفوظ کرتا جاتا ہے جن کے مجموعے سے شاعر کی عمر عبارت ہوتی ہے۔

اکتساب کمال کی حد تک، امیر مینائی محدث بھی تھے فقیہ بھی، ادیب و محقق بھی تھے، شاعر بھی، وغیرہ۔ ان کے کتنے ہی لمحات شعر سوچنے اور کہنے میں صرف

ہوئے ہوں گے تصور کیجیے کہ ان پر بحیثیت ایک باکمال شاعر کے احساسِ کیفِ بہار، احساسِ جذباتِ نفس، احساسِ جذباتِ جوانی و مستی، احساسِ جذباتِ محبت و عشق، احساسِ جذباتِ عجز و حسرت، احساسِ جذباتِ یاس و الم، احساسِ وجدانِ فکر و فنا اور احساسِ حبِّ خدا و رسولؐ وغیرہ وغیرہ میں کیا گزری ہوگی۔

"عالمِ خیال"

حسن و عشق کی دُنیا

سوچا امیر مینائی نے شاعر کے لیے عالمِ خیال ایک جامِ جہاں نما ہے کتنا عجیب ہے نا؟ اور ہائے اس کے تصور کی بوقلمونی !! کیسے کیسے نقشے آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ہر شعر مرقع پہلے ہوتا ہے شعر بعد کو بنتا ہے فطرت کے فنکار نے دنیا کے حسن خانے کو اپنے ہاتھ سے سجایا ہے تو کیوں [illegible] حسین و جمیل چہرے جنگل کے ان پھولوں کی مانند ہیں جو کھلتے بھی ہیں مہکتے اور جھومتے بھی ہیں، مرجھا بھی جاتے ہیں۔ وجہ کوئی نہیں جانتا اور نہیں پوچھتا۔ نہیں [illegible] گلاب تو زیب و زینتِ خانہ و محفل ہوتے ہیں، مشرق میں ہوں یا مغرب میں۔ تابناک چہرے جو شباب کی شراب سے ارغوانی ہو جاتے ہیں نگاہوں اور دلوں کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں پھر جو عاشق ہو وہ تو بک جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں تو ان [illegible] میں سے کسی کی ہو رہتی ہیں۔ ساتھ اس کے پھریں اگر داس کے گیسو [illegible] کا جماسے رہیں چاہیں کہ نثار ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دو رنگ اور [illegible]

روح کی ساری تڑپ اور دل کی ساری بیتابی نظارۂ رُخِ جاناں سے جو کیف پاتی ہے اسے کیا کہیئے۔

مزہ عاشق کے دل سے پوچھ حسن شعلہ رویاں کا
تماشہ دیکھ پروانوں کی آنکھوں سے چراغاں کا۔

کہیں یہ شعلہ روحسینانِ جہاں ہیں اور عشّاق ان کے دیوانے۔ یہ سخت دل، جفا کار، عیّار ہیں۔ فتنہ نواز و فتنہ پرور ہیں۔ قاتل ہیں، صبر آزما ہیں اور اس پر مسرور، سخت دل نہیں تو بھی عشّاق کے دل کو کیا کیجیئے۔ ان کی پیاس ان پر قربان ہونے ہی سے بجھتی ہے۔ کہیں یہ ہستیاں انتخابِ روزگار بزرگ تریں خلائق ہیں اور ساری خلقت پروانہ، کیسی عجیب بات ہے! ہے نا؟ آہا!! چار طرف چراغاں ہے! اللہ پروانوں کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔ بس یہی حال یا کچھ اس سے سوا دل کا ہو جاتا ہے۔ باغِ فطرت مصوّر کی بوقلمونیوں سے کیسا رنگا رنگ ہے۔ جدھر دیکھئے صورت نئی، انداز نئے، رنگ و روپ نرالا:

اس مرقع میں عجب نیرنگیاں ہیں حسن کی
جب نظر اٹھی لڑیں آنکھیں نئی تصویر سے

واللہ نگاہ چاہیئے ورنہ تو ؎

سینکڑوں لالہ رُخ و سرو قد و غنچہ دہن
دیدنی ہے چمن عالم امکاں کی بہار

بتاؤ امیرؔ

دمِ فکر ہے دھیان کس خوب رُو کا
کہ آتے ہیں مضموں سانچے میں ڈھل کر

تمھارا محبوب جو انداز و ادا میں یگانۂ روزگار ہے، شیریں بیاں بھی ہے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ آٹھوں پہر کھیلتی رہتی ہے تو پھر تم اس کے اوصاف پوچھنے والے سے کیوں نہ پوچھو کہ:

لوٹ ہے جس پہ تبسم وہ دہن کس کا ہے؟
باتیں منہ چوہیں وہ اندازِ سخن کس کا ہے؟

شروع دنوں کی بات ہے لیکن ہنوز ہو بہو یاد ہے جب پہلی بار اسے دیکھا:

مسکرایا وہ اس ادا سے امیرؔ
میں تو سمجھا کہ اب گری بجلی

کھنچے ہوئے بانکے ابروؤں تلے بڑی اور سیاہ آنکھیں مسحور کر لینے والی ہیں میری جانب جب آجاتی ہیں دیوانہ بنا جاتی ہیں:

زیرِ ابرو شوخیٔ چشمِ پری رو اور ہے
اس چمن میں طرزِ جستِ فتنہ خیز آہو اور ہے [۱]

---

[۱] دیکھیے یہاں امیرؔ مینائی نے اسی رعایتِ لفظی و معنوی سے پُرکارانہ و استادانہ کام لیا جو ان کے رنگ طرۂ امتیاز ہے۔ حقیقت مجاز میں یوں پیوست ہے کہ لطف ہاتھ سے جانا کیا معنی دوبالا ہو جاتا ہے۔

صانع نے انسانی دل و دماغ کو کیسا طلسم بنایا ہے تصور پرور محبت آفریں
..... کیفیت زا ..... محبوب میں انداز و ادا کا بانکپن، لگاوٹ کے درجے کو پہنچا ہوا
پاتا ہوں۔ کرشمے اس کے جی کو لبھانے والے اور شوخی قاتل ہے ... ناز اس پری پیکر،
پری طلعت کے، پریوں ہی جیسے ہیں۔ دل میں خود ہی نہیں آیا ہے، پری خانہ ساخۃ
لایا ہے[1]۔ پھر یہ کہ مست ہے حسن و شباب کی شراب دو آتشہ سے مست۔ یہ
مستی اس کی آنکھوں سے چھلکے، بشرے سے چھلکے .....، ظالم کی رفتار سے چھلکے،
گفتار سے چھلکے، اُٹھنے سے ظاہر، بیٹھنے سے ظاہر، میری آنکھوں میں بسا ہے،
دل و دماغ میں بسا ہے، رگ و پے میں سمایا ہوا ہے .....

تصوّر ایک مست حسن کا ہے یوں مرے دل میں
رواں رہتا ہے دریا جس طرح آغوش ساحل میں

ہر آن اس میں نئی شان نکلتی پاتا ہوں۔ پھر آرائش جمال کے نت نئے
طریقوں، زیبائش کے انوکھے انداز کے ساتھ سامنے جب وہ آجاتا ہے آرزوؤں
کی نگری میں جیسی ہلچل مچ جاتی ہے۔ کچھ عشّاق ہی جانتے ہیں امیرؔ:

جب کبھی اس کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں
دل ہی واقف ہے جس ایمان سے ہم دیکھتے ہیں

اس جلّاد سے جا کر کوئی ہماری طرف سے یہ کہہ دینا کہ قتل ہے بے خنجر و شمشیر مدِّ نظر ہے
تو اک ذرا آپ کو کھینچے ہوئے رہیے اور بس کام ہمارا تمام ہوا[2]

---

[1] ناز و انداز و ادا، غمزہ، کرشمہ، شوخی — لے کے آیا ہے پری خانہ پری رو دل میں (امیرؔ)
[2] قتل بے خنجر و شمشیر جو ہو مدِّ نظر۔ اک ذرا آپ کو کھینچے ہوئے جلّاد رہیے (امیرؔ)

بھلا کون ایسا ہوگا جو ان بانکے رہزنوں کو دیکھتا ہوگا اور متاعِ صبر و قرار نہ کھو بیٹھتا ہوگا۔ یارو اپنا کہنا تو یہ ہے کہ

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

چھیڑ چھاڑ کی دُنیا

مزہ یہ ہے کہ ہم سے پوچھ گچھ ہے۔ کیوں صاحب کیوں اتنے بیتاب ہوتے ہو؟ جان جسے عزیز بتلاتے ہو کیوں کھوتے ہو۔ پھر کیا ایسا بڑا کام کیا ہے جس پر نازاں ہو......

کون ان کو ان کے تیور کی بے پناہیاں، نگاہوں کی فسوں کاریاں سمجھائے بڑا ہی کوئی دل والا ہوگا جو ان حربوں کی تاب لا پایا لائے۔ کیسے ان سے مخاطب ہو کر کہے کہ ایک ذرا کے ذرا آئینے کے مقابل آکر کھڑے ہو اور......

پہلے تم اپنی چتون اپنی نظر کو دیکھو
پھر جس نے دل دیا ہے اس کے جگر کو دیکھو

اور آمیہ اِس محفل، اس وقت، اس لمحۂ عشرت کا حال بھلا کیا بیاں ہو جب

ترپا ہیں جو آنکھوں کو پسند آگئیں آنکھیں — دل لوٹ گیا چوٹ غضب کھا گئیں آنکھیں
اور وں سے تو بیباک سرِ بزم لڑا کیں — عاشق سے ہوئیں چار تو شرما گئیں آنکھیں
اس ناز سے دیکھا کہ بہم کٹ گئے عاشق — ایک ایک کو ایک ایک سے لڑوا گئیں آنکھیں

نہیں کہ مجھ پر عنایت نہیں اغماز ہی التفات کا غماز ہے محفل میں دیکھتا ہوں

غیروں سے ہیں باتیں بھی عنایت کی نظر بھی
پر دیکھتے جاتے ہیں کنکھیوں سے اِدھر بھی

ہائے ظالم کے بناؤ اور بگاڑ دونوں ہی میں لطف ہے، بناؤ قیامت، سادگی قیامت۔ بیساختگی کا تو کہنا ہی کیا۔

وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بیساختہ پن کی
سنورنے سے بگڑتے ہیں بگڑنے سے سنورتے ہیں

تنہائی میں میری وارفتگی پر اُس کی یہ بہیم خفگی کوئی دیکھے۔ اللہ! وہ جانتا نہیں ہے۔ جمیل چہرے پر جلال کے آثار، بے داغ پیشانی پر شکن، جوش میں کانوں کی لویں لال بھبھوکا۔ رخِ صبحِ گلنار، حسین آنکھوں سے غیض جیتوں سے غضب ٹپکتا ہوا، گردن کچھ میری جانب گھومی ہوئی، کچھ مجھ سے پھری ہوئی، بدن میں ایک بانکا تناؤ، مجسمہ طرحداری بنے ہوئے ہیں حسن کی تابش سوا ہے۔ جانِ امیر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے تو حقیقت تو یہ ہے کہ:

تجھ کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

پر اب خفگی کو جانے دو۔ بس ؎

اٹھو گلے سے لگا لو مٹے گِلہ دل کا
ذرا سی بات پر ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

کیا؟ نہیں؟ چاہ سے تو انکار نہیں ہے نا؟ تو پھر منظور کیا ہے؟ آزمائش؟

واللہ!! اوہ، کیا آج سرکار کی نیت یہی ہے؟ سبحان اللہ.....

کمر لچکتی ہے، خنجر سنبھل نہیں سکتا
اور آپ آئے ہیں عاشق کے امتحان کیلئے

اور ہاں اوپر خود غلط جفا کار، یہ خفگی آٹھ پہر تو نہ رہے۔ کیا ہو جو ہم بھی خفا ہو جائیں

روٹھنا ناز و ناز کا ٹھہرا ہے تو یہ سن رکھئے
روز کے روٹھنے والے کو مناتے بھی نہیں

مگر امیر!! یہ تم کیا سوچتے رہتے ہو؟ کیا کہہ رہے ہو؟ تم کہ ایک ایک نگاہ التفات کو اس کی ترستے ہو کیونکر اس سے پھر جاؤ گے؟ خفا ہو جاؤ گے؟ باغ میں جاتے ہو، گل و نرگس کو دیکھتے ہو تو جھوم اٹھتے ہو، پکارنے لگتے ہو..... کہ....

ہوئے مست دیکھا جو پھولوں کا رنگ
پیالوں میں تھی ارغوانی شراب

کیا تمھیں اس شخص کا حال بھول گیا جو بزم یار میں آیا اور اس صنوبر قامت کو دیکھا کہ لباس خوب زیب تن کئے، پھولوں کا گہنا پہنے، صراحی میں سرخ شراب لئے، بلوریں جام اٹھائے، اک ادائے خاص سے آیا ہے اور کھڑا ہے، ہلکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر، شرارت اس کی آنکھوں میں، اور ہلکی سرخی چہرے پر ہے، تو اس سے رہا نہیں گیا۔ قلقل کی صدا سننے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ چاہا کہ یار اس کے پاس آئے اور مسکرائے، ہاتھوں میں جام لے کر بڑھائے، تمھاری ہی زبان میں کہنے لگا۔

چلے ساقی! ہنسے بولے اکڑ آئی ہے یاروں میں
دلہن بن کر بیٹھے دختر رز بادہ خواروں میں

اس نے دیکھا کہ جام کو ساقی نے آتشیں کیا اور دور میں لایا اس کو، اس کو اور اس کو دیا۔ ندیدے نے جانا کہ:

میخانے میں دور مے کا رنگ نہیں ہے
اندر کے اکھاڑے میں ہے یہ رقص پری کا

لیکن پایا کہ ساقی مخاطب ہی نہیں۔ نہ جام دیا، نہ دیکھا، تو پکارا کہ:

ساقی! ہوں تیری بزم میں میں تشنہ جگر بھی
صدقے تیری آنکھوں کے کوئی جام ادھر بھی

ساقی تھا کہ خبر بھی نہ ہوا۔ تب سمجھا کہ اس سے کام نہ چلے گا، دیر ہو چکی ہے، بات کا انداز ذرا بدل دے۔۔۔ اور پکارا:

ساقیا جاتے ہیں پیاسے تیرے میخانے سے
گھونٹ دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے

وہ یوں بھی مخاطب نہ ہوا تو اب؟!! اسے لو وہ تو چلا، جائزہ لیتا ہوا، جام و صراحی سنبھالے، بعض پر نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہوا۔ پر اس مشتاق، چشمِ ناز پر اٹھتی ہوئی نظر بھی تو نہیں ڈالتا۔ ظالم نے جام نہ دیا تھا نہ دیتا۔ کب اس کی پیاس تھی۔ مقصود تو وہ نرگسی آنکھیں تھیں۔ ان سے نکلنے والی بے خطا مخمور نگاہیں تھیں۔ یہ آنکھیں کتنی ستمگار ہیں۔ کیسی خوبصورت، حسین، کیسی مست و ساحر۔ جس پر مسکرائیں نہال کر جائیں

سوچا کہ نزدیک سے ہو کر تو گزرے گا۔ بیقرار نہ ہو اے دل .... ہمت کر اور بڑھ کے تھام لے دامن۔ کہہ تو سہی۔

او کماں ابرو!! ادھر بھی سرسری کوئی نگاہ
تیر کے مشتاق ہم بھی ہیں نشانے کی طرح

دیکھنا وہ آپ ہی آپ مسکرایا بھی، شرمایا بھی، اور اب محفل پہ نظر ہے۔ کوئی نگراں تو نہیں؟ کہدو کہ ......

نہ مست ہے نہ کوئی ہوشیار باقی ہے
حجاب کس سے اب اے چشمِ یار باقی ہے

پھر اک خلص ادا، خاص وضع سے آنچل تھامے چپکے سے اس طرح ساتھ ہو لیا کہ ساتھ والا دیوانہ ہو جائے۔ کپڑے پھاڑنے کو جی چاہے .... اس پہ یہ ہزار اندازِ دلبرانہ، آہستہ سے ابروؤں کو اٹھانا، یعنی سبب اس وارفتگی کا پوچھنا۔ ہمراہی کا بے اختیارانہ کہنا کہ :۔

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ اُلٹا مرے چاکِ گریباں کا

پھر دونوں کا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نکل آنا خانہ باغ میں .... کتنا عجیب تھا اس وقت کا وہ منظر، بھری برسات کے دن تھے، نیلی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، دور جانب شمال مشرق سلسلۂ ہمالیہ کے پیچھے سے لامتناہی بدلیاں امنڈتی آرہی تھیں۔ ہمراہی کو خاموش دیکھ کر یار مسکرایا اور پوچھا۔ کہو کیا یاد آیا؟ جواب میں

ہمراہی پشت پر لہرانے والی کالی ناگن سے کھیلنے لگا اور بل کھولتے ہوئے اُس کے کہنے لگا

تم بھی جُوڑا کھول دو وہ آگئی
بال کھولے گیسوؤں والی گھٹا

پھر فراز کا آنسو بھر لایا اور کہا۔ "کل اسی منظر کو تیرے بنا بھی دیکھا تھا اور کہا تھا:

کیا بلا جھوم کے گھنگھور گھٹا آئی ہے
ہائے اس وقت میرا گیسوؤں والا ہوتا

وہ "ہائے" آج "مستی و رندی" میں بدل گئی ہے ع

وہ اُٹھی ہے گھٹا، وہ برق چمکی، وہ بہار آئی

دیکھو ہوائیں کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہیں، درختوں پر کیسا جوبن ڈال ڈال پر کیسا نکھار ہے، ہر طرف ہری گھاس کا فرش بچھا ہوا ہے۔ اس سمے چڑیوں کے چہچہے کتنے مرغوبِ خاطر ہیں۔ کوئل کی کُوک، پپیہے کی پی کہاں، سنو! مور زور زور سے پکار رہے ہیں۔ یقین ہے کہ ناچتے ہوں گے۔ ساری کائنات مست و بیخود ہے۔ میں ہوں تو ہے اور یہ خانہ باغ۔

بہار آئی ہے ساقی جام فیضِ مے پرستی ہے
در و دیوار سے اس دور میں مستی برستی ہے

اس نے کہا اس سرزمینِ جنّت نشاں کا موسمِ بہار تو برسات ہی ہے۔ ہمارے گرد و پیش ان دنوں کتنا مست و روح پرور ہو جاتا ہے، امنگوں، آرزوؤں کو بڑھانے والا۔ جذبات کو لطافت و مستی بخشنے والا۔" ہمراہی نے کہا "ہاں مگر،

بے چشمِ مست یار نہیں لطفِ مے کشی

اس پر اس کا خوب ہنسنا لیکن ہمراہی کو افسردہ دیکھ کر پوچھنا "کیوں؟" اس کا کہنا کہ "آج عیش کے پورے سامان ہیں۔ ہم ہیں، تم ہو، بہار ہے۔ مگر تا بہ کے؟

یہ چرچے، یہ صحبت، یہ عالم کہاں
خدا جانے کل تم کہاں، ہم کہاں"

اس کا کہنا۔ "اب تو آرام سے گزرتی ہے" [1]

اس پہ دونوں کا مل کر ہنسنا . . . .

بہار کی مستی، بہار کا کیف، نس نس میں سمائے ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ یہ سب کچھ ایک عالمِ خیال تھا۔ تم نے امیر جھوم جھوم کے کس طرح پڑھا تھا۔

ذوقِ مے نوشی بڑھاتی ہے گھٹا برسات کی — اور لے اُڑتی ہے مستوں کو ہوا برسات کی
اے پری اس فصل میں سرگرم آرائش نہ ہو — آگ تلووں میں لگاتی ہے حنا برسات کی
ابر، دریا، سبزہ، ساقی، یار، مطرب، دخترِ رز — ہو یہ سب ساماں تو پھر دیکھیں فضا برسات کی
شیرۂ انگور کو کرتی ہے آبِ آتشیں — آگ پانی میں لگاتی ہے ہوا برسات کی
رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نوعروسانِ چمن — پتے پتے سے ٹپکتی ہے ادا برسات کی
زاہدوں کی توبہ ٹوٹی، لڑکھڑایا پائے شیخ — کچھ عجب مستانہ رُت ہے ساقیا برسات کی
شوخیاں ہیں دخترِ رز کی، بجلی کی چمک — بوتلیں ہیں مے کی یا کالی گھٹا برسات کی
دخترِ رز سے کہہ دے ساقی اور کھینچے پاؤں — فصل آ پہنچی ہے او نا آشنا برسات کی

---

[1] یہ مصرع امیر مینائی کا نہیں۔

جب چمن میں آگیا مستوں کو ساون کا خیال ساونی گاتی ہوئی آئی گھٹا برسات کی
مور ناچے، کوئلیں کوکیں، پپیہے بول اٹھے وصل کے دن آ گئے فصل آئی کیا برسات کی
ڈال کر جھولا چمن میں تم نے جب گائی ملہار پینگ دینے کے لئے آئی ہوا برسات کی

کیا تری زلفِ سیاہ کو دیکھ کر شرما گئی
بھیگی بھیگی رات ہے لے مہ لقا برسات کی

دل خوش ہے تو چہار جانب نئی زندگی نظر آ رہی ہے۔ دیکھنا امیر

فصلِ گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں بڑھ کے رضواں سے ہے ان دنوں دماغِ باغباں
ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے شاخ پر کر رہے ہیں سجدۂ شکرِ خدا لئے انس و جاں
قُم باذنِ اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار جی اٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں
جھوم کر آیا ہے ابر کوہساری باغ میں رقص میں ہے ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا نکہتِ گل میں بھی ہے کیفیتِ شرابِ ارغواں

آئینہ خانہ ہے گلشن آئینہ ہے برگ برگ
جلوہ گر ہے ہر طرف رنگِ بہارِ بے خزاں

اس چمن میں کہیں تم پھول پتے سفید پاتے ہو، کہیں گلابی، کہیں لال، کہیں ہرے کہیں پیلے اور کہیں اودے، نیلے، یہ تختہ زعفران کا ہے، وہ سرسوں پھولی ہے، وہ رہے بیلا، چنبیلی، موتیا، اور جوہی، اور یہ رہی گلاب باڑی وہ سنبل و سوسن ہے، یہ لالہ و ریحان و یاسمن، سب کیا بانکے ہیں، کتنے طناز! تم آرزو کرتے ہو کہ،

آئیں پہن پہن کے نئے گلبدن لباس
یا رب ہزار رنگ کے بدلے چمن لباس

گلزار میں پتہ پتہ، ڈال ڈال، نمونۂ صنعت پروردگار ہے۔ تم پوچھتے ہو یہ کلی جو آہستہ آہستہ پھول بن رہی ہے کیا مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے؟ کہتی ہی ہوگی ورنہ تصور کی دنیا میں کون گنگنانے لگا ؎

دیکھ نکلی ہے پری صبح کے پری خانے سے[1]

بوستانِ ہستی میں ایسی کتنی کلیاں اب تک کھل چکی ہوں گی؟ بھلا کون بتائے! اس کی خبر تو صرف اسی کے پاس ہے جو یہ گل کھلا رہا ہے۔ ہائے ان کے رنگ اور ان کی بُو، باس۔ یہ آج ہیں کل نہ رہیں گے۔ کہاں چلے جاتے ہیں؟ گُل بوٹے ہی نہیں ہم سب بھی آخر کہاں چلے جاتے ہیں؟ یہ معصوم، خوش خوش قلقاریاں مارتے بچے، یہ مست جوان و جمیل لڑکیاں اور لڑکے، مرد اور عورتیں، ادھیڑ اور بوڑھے۔ سب کہاں سے آئے؟ کیوں آئے پھر کہاں چلے؟

شبیہہ مدِ نظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اترتی
مٹا دیئے صانعِ ازل نے نقشے بنا بنا کر

یا شاید:

امیر صانع قدرت کا کھیل ہے دُنیا
بنا بنا کے مٹائی ہیں صورتیں کیا کیا

---

[1] ہر کلی کہتی ہے کھل کر تیرے دیوانے سے۔ دیکھ نکلی ہے پری صبح کے پری خانے سے

مگر دیکھو تو سہی یہ زمین اور آسمان، یہ سورج اور چاند، یہ رات میں جگمگ جگمگ کرتے تارے، اور حرکت کرنے والے سیارے، یہ پہاڑ اور صحرا، یہ سمندر اور دریا، چہچہاتے، لہلہاتے چمن اور ہولناک سنسان بیابان، پانی، خشکی، اور ہوا میں بسنے والی مخلوق اور ان سب سے پہلے انسان؟!! یعنی خود میں؟!! کیا بات ہے ان کی، اور سب سے بڑھ کر میری!!! کہیں میں آباد ہوں نخلستانوں، سبزہ زاروں میں، کہیں پہاڑوں کے درّوں یا غاروں میں، کہیں زمین کے پیٹ سے ہیرے نکال رہا ہوں، کہیں دریا کی تہوں سے موتی۔ کہیں فضاؤں کی بلندیوں سے ہمکنار ہوں، کہیں اس سے بھی آگے پہنچ گیا ہوں۔ کہیں سمندروں کو چیرتا گزر رہا ہوں کہیں خشکی پر دوڑتا پھر رہا ہوں، کہیں میں ہنسی خوشی بسا ہوا ہوں، کہیں لڑ رہا ہوں رو رہا ہوں۔ مر رہا ہوں، کہیں ظالم ہوں کہیں مظلوم، کہیں حاکم ہوں، کہیں محکوم۔ کہیں شاعر، مغنّی یا نقّاش ہوں، کہیں حکیم، مبصّر یا سیاس، کہیں بنا رہا ہوں کہیں ڈھا رہا ہوں، کہیں کھو رہا ہوں، کہیں پا رہا ہوں، دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، بولتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، سوچتا ہوں، سمجھتا ہوں، یہ سب کھیل تو ہرگز نہیں کیا بیاں ہو تیری قدرت کا، کارساز اعلیٰ:

عجب دلچسپ نقشہ عالم ایجاد رکھتا ہے
جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اسے دل یاد رکھتا ہے

ہجر و فراق کی دُنیا

دن شروع محبّت، شروع بہار کے انسانوں کی زندگی میں تیزی سے گزر جاتے ہیں

جلد ہی دور رنجوری و مجبوری کا آجاتا ہے' اِس میں آزمائش ہوتی ہے' اداسی' یاس، بے قراری' گریہ و زاری' اس دور کی خصوصیات ہیں۔ امیرؔ اس سے واقف تھے۔ پھر اسے شعر کا جامہ پہنانے کے لئے سوچنا شروع کیا تو اس دھیمی اندرونی آواز کا خیال آیا جو آغاز ہی میں پکار رہی تھی کہ

دل لگی سمجھے ہو آنا دل کا
جان جاتی ہے جب آجاتا ہے

اور پھر ملجاجت کہا تھا:

امیر اک ذرا دیکھے بھالے ہوئے
محبت میں دل کو سنبھالے ہوئے

آج دیکھو نا!.....

یار کے اُٹھتے ہی برہم ہو گیا سامانِ عیش
مے کہیں' مینا کہیں' ساقی کہیں ساغر کہیں

سوچا امیرؔ نے کیسا سنگدل کتنا ظالم ہے دلبر' نس نس میں اس کی یاد بسی ہوئی ہے' ہر کہیں دیکھتا ہوں کہ اسی اپنے انداز سے کھڑا یا بیٹھا مسکرا رہا ہے' نگاہوں میں شوخیاں ناچ رہی ہیں۔ آنکھوں سے شرارت جھانکتی ہے۔ چتونیں تیکھی ہیں' انداز بانکا بانکا۔ کیا وہ آگیا امیرؔ؟

آنکھوں کے آگے آگے کھڑی ہو گئی وہ شکل
جونہی ذرا پلک سے پلک آشنا ہوئی

وہ مگر کہاں !! میری آنکھیں، میرا دل، میری روح، اس کے فراق میں تڑپ رہی ہے
نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام ہے...... وہ مگر کہاں؟ ستمگر سے کس عاجزی سے کہا تھا:

کچھ تسلّی دلِ زار کو کرتے جاؤ
تم نہ آؤ مگر اقرار تو کرتے جاؤ

اللہ !!

تھا جو کل تک کسی کے زانو پہ
آج وہ سر ہے اور زانو ہے

یہ دن امیر یہ راتیں، کیونکر کٹیں گی؟ کیا دشت یاس کی خاک چھانتے ہی ہوگی؟
فراق کے بیابان ہول خیز سے گزرنا ہی پڑے گا۔ کیسے جیو گے؟!! محبت کے ان سنسان
بیابانوں میں نہ کوئی ہمراہی ہوگا نہ غمخوار کتنے ہی دشت نوردوں کا تو یہ بیان ہے کہ

راہ رو کا ذکر کیا ہے سرزمینِ عشق میں
سینکڑوں منزل نشاں نقشِ پا ملتا نہیں

آگئے ہجر و فراق کی تپتی ہوئی ریت، مصائب و یاس کے بلند بے آب و گیاہ پہاڑ
وحشت اور ہولناکیوں کے راہ بھلا دینے والے جنگلوں سے گزرنا ہے۔ چھالے تو ابھی
سے پڑ گئے ہیں، ارے کیا گرنے لگے؟! یہاں کون ہے جو یاری کرے گا۔ مگر صحرا کے
نظر نہ آنے والے فرشتو:۔

کانٹوں سے کہو سنبھال لینا
غش آتا ہے اک برہنہ پا کو

لو امیر اب جی کھول کر رو لو، ہاں !! اور... غلط نہ ہو گا جو کہو کہ :

میری طرح نہ اک دن ابرِ بہار رویا　　وہ ایک بار رویا میں لاکھ بار رویا
مجنوں سے میں نے پوچھا کل حال بیخودی کا　　کچھ کہہ سکا نہ منہ سے پر زار زار رویا
پوچھی امیر سے کل میں نے جو دل کی حالت　　سینے پہ ہاتھ رکھ کے بے اختیار رویا

لیکن تصور کرنا اس دل کی حسرت کا جو محبت محبوب سے لبریز تھا۔ اگرچہ بادشاہ وقت اس کا رقیب تھا۔ کہنے والوں کا بیان ہے شاہ نے شیریں کے ذریعے کہلوا دیا کہ بے ستون سے جوئے شیر لاؤ تب ہم سے ملنے کا خیال کیجئو۔ کون نہیں جانتا کہ ناممکن بہر حال ناممکن ہی ہے۔ لیکن فرہاد !! ؟ وہ اس پر بھی خوش ہوا اور کہا "اچھا" !! اس کا تیشہ تو بار بار یہی کہتا تھا کہ

ارے تیری مشقت[1] رائیگاں ہے

لیکن وہ کیسے جانتا تھا کہ :

عشق شیریں میں نہیں فرہاد بھی خسرو سے کم
ایک عالم ہے محبت میں گدا و شاہ کا

تم پاس ہوتے تو کیا مشورہ دیتے ؟!! شاید یہ کہ

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر　　سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کوہکن، کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں　　ہے جو عاشق دل معشوق میں گھر پیدا کر

---

[1] صدایہ تیشۂ فرہاد کی تھی ؏ ارے تیری مشقت رائیگاں ہے
ذرا لفظ "ارے" کا صرف اور اس کی بلاغت ملاحظہ ہو

لیکن ہائے !! یہ آگ جب روح میں روشن ہو جاتی ہے تو عشاق کسی آزمائش کو خاطر میں کب لاتے ہیں ان کا کہنا تو بس یہی ہوتا ہے کہ:

عشق میں جی سے گزرتے ہیں گزرنے والے   موت کی راہ نہیں دیکھتے مرنے والے
دم تری الفت پوشیدہ کا بھرنے والے   دل جلے سینہ جلے اف نہیں کرنے والے

فراق کی کٹھن تنہائیوں میں سچا عاشق یار کو مخاطب کرکے یہی کہتا ہے:

دل مرا اور آرزو تیری
جان صدقے ہو ایسی حسرت کے

ہجر و حسرت کے اس عالم میں تم پر جو بیت رہی ہے تو دل گرفتہ ہو اور سمجھتے ہو کہ

دیکھ لے گا مری حالت جو محبت میں امیر
کوئی کمبخت ہی ہوگا جسے الفت ہوگی

لیکن جب دوسروں کے سامنے آتے ہو تو باوجود ظاہری آثار کے، باوجود اندرونی اذیتوں اور سختیوں کے اکثر سے اپنا حال چھپاتے ہو حالانکہ مشک و محبت نہ چھپے ہیں نہ چھپیں گے۔ یہ تکلف تم سے ہو، لاکھ تم نہیں نہیں کرتے ہو وہ کہتے ہیں:

کھاتے ہو قسم نہیں ہیں عاشق
صورت تو امیر اپنی دیکھو

البتہ کوئی ہمدمِ دیرینہ آنکلتا ہے تو لپٹ جاتے ہو اور ہے یہ ان کا یاد دلانا:

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر
دیکھو تو چار روز میں کیسا حال ہوگیا

اس پر تمھارا ہٹ کر آنسو پیتی ہوئی خود دار آنکھیں ملانا اور کہنا کہ

دل اگرچہ غم سے فگار ہے، مگر اب بھی باغ و بہار ہے
اسی شاخ کا یہ شعار ہے، کہ شکستہ ہو کے ہری رہی

اس کا موضوع بدل کر کہنا کہ "اچھا خاک ڈالو اس پر، آؤ پھر ایک گوشے میں منہ لپیٹے کب تک پڑے رہو گے؟ جو کچھ ہوا ہوا لے بس اب تھوڑی دیر کو باہر بھی آؤ، تازی ہوا کھاؤ، بولو کہاں چلو گے؟ تو ایسے انداز میں جیسے وہاں کوئی اور نہیں نہ تھا خیال کہیں آنے جانے کا دارفتہ مزاجوں کی طرح کہنا:

لے جنوں سے چل اب وہاں کہ جہاں
یہ زمین اور یہ آسماں نہ ہو

ہمدم غمخوار کا کہنا کہ نہیں چلتے ہو تو اچھا نہ چلو۔ تم سے ملے ایک زمانہ ہو گیا یہیں بیٹھو اور کچھ مست بہاریہ، ولولہ انگیز شعر ان غزلوں کے سناؤ جو ہمیں تمھاری ہی زبان سے سننا ہیں اطراف و جوانب میں تو دھوم ہے۔ اس پر تمھارا حسرت اس ہمدم دیرینہ کو دیکھنا اور کہنا:

خزاں میں کہیئے نہ بلبل سے چہچہانے کو
کہ وہ بہار کی باتیں گئیں بہار کے ساتھ

اس کا تسلی دینا کہ اتنے ہراساں کیوں ہوتے ہو؟ کچھ اپنے آپ کو سنبھالو۔ وہ دن بھی تو یاد کرو نا، جب یار تھا، تم تھے اور خانۂ باغ، کیاریاں تھیں، روشیں تھیں، چہچہے تھے، قہقہے تھے "ہر روز روزِ عید تھا ہر شب شب برات"، کیوں اپنے اللہ سے اتنے ناامید ہوتے ہو!! اس پر تمھارا کچھ سوچنا جیسے ماضی کو مصوّر کرنا

چاہتے ہو اور بن نہ رہا ہو۔ پھر آہ بھر کر کہنا :

طول فرقت میں مزے وصل کے سب بھول گئے

نہ وہ راتیں نہ وہ باتیں نہ وہ دن یاد رہے

اور پھر رو دینا، اس کا کہنا کہ نئی نئی بات ہے اس لئے یہ حال ہے ساتھ ہی انسان ہو۔ رفتہ رفتہ قرار آ ہی جائے گا، کیا عجب بھول بھی جاؤ اس بے وفا ستم لیش کو۔ یہ سن کر تمھارا روتے میں مسکرانا اور دل پہ ہاتھ رکھ کر خود سے پوچھنا۔

اسے طول زمانۂ اسیری

بلبل کہیں گل کو بھولتی ہے؟

تھک ہار کر اس کا کہنا کہ "اونہہ" اچھا اپنا حال ہی پوری طرح ہم سے بیان کر دو یونہی کچھ بوجھ دل کا ہلکا ہو۔ تمھارا طاق پہ دھری، شب کی جلی شمع کو غمگین نگاہوں سے دیکھنا پھر کہنا :

شمع پر گزری ہے جو شب تا سحر

مختصر سی ہے ہماری سرگزشت

جان لیا ہمنشیں نے کہ تنہائی منظور و مرغوب ہے۔ اٹھا اور چل دیا !! اور پھر آہ وہ تنہائی !!

باہر باغ میں کلیاں کھل کھلائیں اور میٹھی بولی والی چڑیاں چہچہائیں کہ بہار آئی ہے امیر۔ مگر دل کہتا تھا کیسی بہار !! یار کے بغیر بھی بھلا کہیں بہار ہے۔ باہر آئے در پکڑ کر سر اس پہ ٹیک کر کھڑے ہو گئے، آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا۔

"اے پھولو نہ مہکو، اور اے چڑیو نہ چہکو! ظالموں کیا امیر کی اتنی بھی دلداری نہ کروگے؟
ایک زمانہ تھا جب وہ تم پر جان چھڑکتا تھا۔ آج دکھی ہے! اب تھوڑی دیر میں
رات آجائے گی اور اپنی ساری ہولناکیاں ساتھ لائے گی۔ اے کاش بجائے اس
کے موت آتی۔ مگر:

اسی سے غمزے کرتی ہے جو تجھ پہ جان دیتے ہیں
اجل تجھ کو بھی کتنا نازِ معشوقانہ آتا ہے

میں کہتا ہوں کہ

عمر کو سارا زمانہ گزراں کہتا ہے
دن جدائی کے مگر عمر میں محسوب نہیں

اے کاش کوئی دیکھتا۔ کس طرح رات کی اندھیاری فراق کی اندھیاری کو بڑھاتی
ہے، آنکھوں کا آرام، دل کا سکھ چین تو ایک مدت ہوئی چھین چکے۔ کاش اوہام اس
طرح نہ ستاتے۔ جیسے کوئی بڑی بلندی سے گرتا چلا آرہا ہو اور جانتا ہو کہ بس نیچے
گہرے کھڈ میں چٹانوں سے ٹکرا کر مرجانا ہے۔ لیکن اس لمحۂ اذیت سے ہنوز گزر نہ چکا
ہو، گر رہا ہو، گرتا چلا جا رہا ہو اور گر نہ چکا ہو! امیر

ابھرتا ہے کلیجہ، ڈوبتا ہے دل، خدا حافظ
سمندر پیرنا ہے جھیلنا شب ہائے ہجراں کا

مگر ٹھہرنا ذرا!! یہ دور جو رات کے سناٹے میں کسی نے بانسری چھیڑی کیا اسے
تمھارے اضطراب کی خبر تھی؟ شاید نہو! لیکن آواز ایک غم دوست، غم نواز کی ہے

کلیجہ کو برما دینے والی ـــــ کتنی پرسوز! کتنی پُردرد!! کس درجہ گلہ کرنے والی۔

دُکھے کیونکر نہ دل آوازِ نَے سے
صدا ہے اور کسی دردِ آشنا کی

کیا "نے" کے جنگل میں اس کا بھی کوئی محبوب تھا جو بے وفا نکلا؟ کیا اسے بھی فراق کی ہولناک اذیتیں سہنا پڑ رہی ہیں؟ نہیں تو کیوں میرے دل کو یہ آواز رلاتی ہے، برماتی جاتی ہے۔ کیوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے دل میں چھپے ہوئے درد سے واقف ہے کیا اس کے نصیب سے بھی سکھ چین چھن گیا۔

دینا نہ تھی کسی کو تو اے آفریدگار
پیدا ہی کیوں کیا تھا خوشی کو جہان میں

لوگ تجھ سے کہتے ہیں امیرؔ کہ ایک صبح ضرور طلوع ہونی ہے جب غم کے یہ کالے بادل چھٹ جائینگے، لیکن تو کیسے یقین کرلے؟ کچھ ان میں سے کہتے ہیں کہ بیشک تیری زندگی کی رات اندھیری ہے۔ طوفان بھی آیا ہوا ہے، موجیں خوفناک شور مچانے والی ہیں اور کشتی طوفان کے رحم و کرم پر ہے، راہ میں بھنور بھی پڑتے ہیں لیکن نہ گھبرا، ناؤ بچ نکلے گی اور صحیح سلامت ساحل کو جا لگے گی۔ کیا!!؟ میں نے تو آج تک نہ پایا، ہوتا ہے خدا جانے کہ ساحل نہیں ہوتا" میرے نزدیک تو نہیں ہوتا۔ ہاں، دریائے محبت سے جو پار اُتر ہیں وہ جانیں، وہ شش فضا پر لہرانے والی بیتاب بجلی سے کہتا ہوں کہ

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی ۔ یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

اللہ کتنی حسرتیں، کیا کیا ارمان دل میں ہیں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ چلو یونہی سہی۔ زندگی یونہی گزر جائے، کیا مرنے کے بعد بھی اس ظالم بھول جانے والے کو ہم یاد آئیں گے؟ افسوس کہ یقین نہیں آتا۔ ارمان ہمارے ہی تبہ ہیں۔ دل ہمارا ہی جو ٹھہرا۔ وہ ظالم جفا کار ہی کیا یہ آٹھ پہر کے ہم نشیں اور غمخوار تک بھول جائیں گے۔

فنا کے بعد ایسے بیکسوں کو کون پوچھے گا
مگر ہاں بیکسی رو رہا کرے گی ہم کو تو برسوں

تجھ پر سے البتہ ہم نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا، دھن دولت چین آرام صبر و قرار، جان بھی، دل بھی، جوانی بھی، شادمانی بھی۔ لیکن اے بیدرد زندگی سارا کا سارا کیا اسی کلفت دیاس میں گزر جائے گا، کیا کسی کو تیرے حال پر رحم نہ آئے گا شاید یونہی ہوتا ہو۔

لاکھوں کو خاک میں تو ملا دے گا آسماں
ظالم سے دو دلوں کو ملایا نہ جائے گا

راحت کو ڈھونڈھتا ہے عبث تو جہان میں
اس کا زمیں میں ہے نہ پتہ آسمان میں

پروردگار! کیا ایسا ظلم بھی کہیں دیکھنے یا سننے میں آیا ہے:

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

خیر ان پر نہیں ہے زور اپنا　　　مر مٹیں گے یہ اختیار تو ہے

دل نے کہا وہ دن بھول گئے جب حال تمھارا ان تک پہنچا تھا اور سن کر طنز سے انھوں نے کہا تھا کہ :

"کوئی مرنے کی حد ہے ! مر نہیں چکتے ہیں مرتے ہیں !"

ہنسے امیر اور خیال ہی میں مخاطب ہونے لگے کہ :

ابھی اے جان تو نے مرنے والوں کو نہیں دیکھا
جیتے ہم تو دکھا دیں گے کہ دیکھ اس طرح مرتے ہیں

پھر اللہ سے رجوع ہوئے کہ "اے دینے والے، وہ بھی تو ہوں گے جو ہجر و فراق کی ان تکلیفوں کو سہتے ہیں اور چپ رہتے ہیں، مجھے بھی صبر دے، قرار دے کلیجہ منہ کو آتا ہے، دل ہے کہ سینے سے نکلا جاتا ہے :

جان سمندر و دل پروانہ دے مجھے
اے سوز عشق ہمت مردانہ دے مجھے

لیکن اے یار عزیز یہ سب کچھ ہیچ ہے، ساری تلمیحیں، ساری تسلیاں : ساری تلقین :

دل سے آکر نہ دل سے پھر نکلے
تم تو ارمان بن گئے دل کے

اب آؤ زندگی مستعار جاتی ہے
کرو نہ غم نے کہ فصل بہار جاتی ہے

رواں ہے نکہتِ گل کی طرح یہ عہدِ شباب ظالم !! رواں ہے نکہتِ گل کی طرح یہ عہدِ شباب

بیتے دنوں کی یاد

امیر مینائی پر مصیبتیں جیسی کچھ پڑیں سوانح عمری میں اس کا حال مفصّل درج ہے ابھی جوان ہی تھے کہ خانہ ویراں ہو گئے۔ در بدر کی خاک چھانتے رامپور آئے۔ یہاں چندے چین پایا، پھر بھی لکھنؤ جو وطن تھا، یاد اس کی رگ و ریشے میں بسی ہوئی تھی، مرتے دم تک نہ جانا تھی نہ گئی کہتے تھے کہ:

کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب
پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا

اک عمر ہو گئی کہ اقامت سفر میں ہے
نقشہ مگر وطن کا ابھی تک نظر میں ہے

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

دیکھ امیر! لوگ خوش خوش لباس نئے نئے پہنے جوق در جوق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پورے روزوں کا رکھنا مبارک ہو اور عید کا آنا مبارک ہو۔ میں بھی کہتا ہوں کہ ہاں مبارک ہو۔ بھلا ان سے کیا کہئے اور کہہ کر کیجئے بھی کیا، لیکن ہے یوں کہ:

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا

باغ میں جائیے، روشوں، تختوں، رنگ برنگی کیاریوں کو دیکھئے۔ ہوائیں خنک، خوشگوار چل رہی ہیں، جھاڑ جھاڑیاں جھوم جھوم کر تالیاں بجا رہی ہیں گویا پوچھتی ہیں کہ ایسے سمے تم کیوں اتنے اداس ہو۔ ہاں، ہم بھی کبھی اسی طرح خنداں و شاداں و نغمہ کناں مصروفِ گلگشت رہا کرتے تھے۔

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں
پھرتے تھے یونہی ہم بھی خوش خوش کبھی وطن میں

اب وطن نہیں تو وہ خوشی بھی نہیں۔ بتا! چمن سے دور رہ کر تو بھی کیا اسی طرح چہچہائے گی ؟؟

بڑھاپے میں وہ وقت بھی آیا جب وطن سے بہت دور دکن کا رُخ کیا اور کچھ سمجھ کر ہی کہا :

اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن
یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا

چونکہ اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے اس لئے ان کا فرمانا یہی رہا کہ

ہدیۂ دوست سمجھ کر میں ہوا شکر گزار
روکھی سوکھی جو ملی نانِ جویں تھوڑی سی

اور فخر کرتے تھے کہ :

جائے شکوہ میری زباں پہ امیرؔ
شکر بے اختیار آتا ہے

لیکن ساتھ ہی مالک کے روبرو عاجزی کرتے تھے۔ یہ کہہ کر کہ :

میں ہوں عاجز اور اس کو عاجزی مرغوب ہے
بے نیازی اس کی میرے ناز برداروں میں ہے

کرتے ہیں عجز جن کو خدا نے دیا ہے ظرف
شیشوں کے سر جھکے ہیں پیالوں کے سامنے

رفعت قصر تواضع سے اگر واقف ہوں
آئیں پھر خانۂ درویش ہیں سلطاں جھک کر

کہتے تھے کہ:

وہ مرے احمال روز و شب سے واقف ہے امیر
پیش خالق ادّعائے بے گناہی کیا کروں،

پکار اُٹھتے تھے کہ:

کیا دیر ہے امیر کے عفوِ گناہ میں — اللہ کیا کمی ہے تیری بارگاہ میں
امیرِ خستہ جاں کی مشکلیں آسان ہوں یارب — تجھے ہر بات آساں ہے اسے ہر بات مشکل ہے

درویشی جو فطرت سے بھی پائی تھی، اور ورثے میں بھی آئی تھی ان سے کہلواتی تھی کہ:

ہم فقیر اپنی فقیری میں شب و روز ہیں مست
تجھ کو اے شاہ مبارک رہے شاہی تیری

اور بے مثال انداز میں سمجھاتی تھی کہ:

موتی کی طرح جو ہو خداداد
تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے

اپنی جوانی انھیں بہت یاد آتی تھی اور کسے یاد نہیں آتی۔ ان جذبات کے اظہار میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور بالکل منفرد، بڑھاپا، معذوری کے علاوہ

مالی بدحالی بھی لایا، اولاد اور گھرانے کی فکریں بھی لایا، لغت کے غیر مکمل رہ جانے کا اندیشہ بھی لایا اور مکے مدینے نہ جانے کا ملال بھی لایا۔ سوچتے تھے کہ آمیر یا تو تم کبھی چوبیس میں سے اٹھارہ اٹھارہ، اُنیس اُنیس گھنٹے کام کرتے تھے، اور نہ تھکتے تھے یا آج دل و دماغ و نگاہ کمزور ہیں، ہاتھ شل۔ یا کبھی یاس پاس نہ پھٹکتی تھی یا آج چار طرف یاس ہی یاس ہے۔ تم کہ آٹھ پہر شاد، مطمئن، مگن رہا کرتے تھے۔ آج فکرمند ہو، انتہائی فکرمند!! یہ کیا ہوا؟!! وہ سارے قلعے جو بنائے گئے تھے کیا ڈھینے کے لئے تھے، اور ساری اسکیمیں ختم ہو جانے کے لیے تھیں۔ ہائے شاید ایسا ہی ہے امیر:

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا

خیال آتا ہے پیری میں جوانی خواب تھی گویا، پلک جھپکتے جھپکتی ہے یہ دن پہلے گزرتے ہیں، بہار کے دنوں میں ہوائیں گاتی ہوئی آتی تھیں اور تمہیں دیوانہ بنا جاتی تھیں۔ آج کیوں نہیں گاتیں۔ کیوں مست نہیں بناتیں، غنچوں کا چٹکنا کیوں ویسا ہی نہیں بھاتا اور بلبل و شیاما کے ترانے دل کو ویسے ہی کیوں نہیں لبھاتے۔ آخر کیوں تصورِ ساقی ماہ وش کے نقشے نہیں کھینچتا؟!! سچ ہے!

عالم تمام اپنی جوانی سے تھا جواں
ہم پیر کیا ہوئے کہ جہاں پیر ہو گیا
جوانی لے گئی ساتھ اپنے سارا عیش مستوں کا
صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ ساغر ہے نہ پیمانہ

ان سجیلے گٹھیلے جسم والوں کو دیکھئے تو سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں ہاں ہاں!!
میرا رنگ بھی کبھی کھلتا ہوا چمپئی تھا۔ میرا قد بھی سیدھا تھا جسم بھرا بھرا اور چہرہ گلنار رہتا۔
کبھی قہقہوں میں میرے بھی آسودگی تھی، گفتار میں شوخی تھی، رفتار میں بانکپن تھا۔

نوجواں کوئی جو پیری میں نظر آتا ہے
یاد آتی ہے بہت اپنی جوانی مجھ کو

مگر سنیں بے فکر نوجوان:

پھول تو سب باغ میں سوکھ کر کانٹا ہوئے
گلبدنوں کی بہار، دیکھئے کب تک رہے

اور یہ بھی کہ

جو ہے بہار اس کو خزاں کا خطر بھی ہے
اے باغباں بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے

بے ثباتیٔ عالم

اللہ ہماری زندگی بھی کتنی عبرت انگیز ہے۔ وہ گلگوں فام، نازک اندام، نرگسیں چشم، آہو خرام، سہی قد ابیلے جو کبھی نزاکت و شباب کی جان تھے۔ ابھی رہے ہی کیا تھے کہ نہ رہے یا تو کبھی آنکھوں میں سماتے۔ دلوں میں جگہ پاتے۔ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے یا آج منوں مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے۔ کبھی پھولوں کی سیجیں منتظر رہتیں، محفلیں اور مجلسیں راہ تکتیں، یا آج نام و نشاں تک ان کا نہ رہا۔ کیسا عبرت کا مقام ہے۔

وہ گلعذار کہ تلتے تھے روز پھولوں میں
انھیں کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں

وہ باجبروت صاحبانِ قوت جن کی ہیبت، جن کے دبدبے سے ملک کانپتے، لوگ تھراتے تھے، ڈنکے ان کے نام کے اور کام کے عالم کے کونے کونے میں بجا کرتے تھے۔ کبھی تھے پر اب نہ رہے، نہ دارا نہ سکندر، نہ کسریٰ نہ قیصر! جو بڑے بڑے تھے جہاں کشاں انھیں کیا ملک نے مٹا دیا۔ نہ عروج چترِ شاہی رہا نہ ضیائے تاج زری رہی۔ اس دور کے لوگ سمجھتے تھے کہ ان بلند ناموں کو بھلا کون مٹا پائے گا صرف ان کے عالیشان قصر اور ان کے خوبصورت محل ہی ان کے نام کو دوام بخش دیں گے۔ افسوس وہ سن نہ پائے ورنہ تو ہنوز او رپیہم سے

زمین قصرِ سلاطیں سے آ رہی ہے صدا
کہ آج منزلِ عشرت ہوں کل مزار ہوں میں

کوئی کان دھر کر سننے والا ہو تو:

نوبتِ شاہی سے آتی ہے صدا شام و سحر
اور کرلے چار دن اس دارِ فانی پہ گھمنڈ

دوسروں کی زندگی میں کبھی بہار اس طور سے بھی آئی کہ خزاں کا خیال کچھ دیر کے لئے خواب ہو کر رہ گیا۔ کیسے کیسے پھلوں اور پھولوں سے انھوں نے باغوں اور چمنوں کو سجایا تھا۔ بیل اور بوٹے، اور پھلدار درخت قدم قدم پر لگائے تھے۔ ان درختوں کی پتیاں تازہ اور پُر بہار تھیں، ان کی شاخیں پھلوں سے لدی اور جھکی ہوئی

تھیں ان پھولوں اور کلیوں کے رنگ اور خوشبو سے فضا معطر رہتی، نسیمِ صبح بھی ان کے پاس سے آہستہ آہستہ گزرتی۔ خوش الحان پرندے جھنڈوں اور جھاڑیوں میں شاخ شاخ چہکتے اُڑتے، بیٹھتے، گاتے پھرتے۔ مگر آج ؟ !

نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے
خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارے
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

غنچے کہتے ہیں کہ کیا جلد گزرتی ہے بہار
مسکرا لینے کی فرصت بھی گلستاں میں نہیں

اور آہ! یہ ظالم زمانہ ان ہی پھولوں، پھلوں اور پتوں پر خزاں بن کر چھایا جو پودوں اور جھاڑیوں میں لگتے ہیں ان کچی کلیوں، بن کھلے پھولوں کو بھی توڑ لیتا ہے۔ جو ابھی ماؤں کی گودوں ہی میں مہک رہے تھے۔ خزاں کی [illegible] خوش رنگ پھولوں کو بھی مرجھا دیتا ہے جو ابھی [illegible] کی ایک [illegible] جو مسکرا نہ سکے تھے، اکلوتے، چہیتے، حسین، جیوٹ، بانکے، سجیلے، کوئی بیٹا تھا [illegible] ہیں، کوئی بھائی، کوئی شوہر تھا کوئی جوان باپ :

ہزاروں برس کی ہے بڑھیا یہ دنیا
مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے

بازار، منبر اور تقریر گاہیں، محفلیں، مجلسیں اور میلے، جن کے چہچہوں اور

قہقہوں سے گونجتے تھے۔ مغنی، مقرر اور شاعر۔ آج ان میں سے کتنے ہیں جو نظر آتے ہیں؟ کہاں گئے؟ کوئی کہتا ہے مر گئے اور مٹی میں مل گئے۔ پر دل کیونکر مان لے کہ:

خاموش ہیں لحد میں جو لوگ خوش بیاں تھے
غنچوں کے جو دہن تھے، بلبل کی جو زباں تھے

لیکن ماننا ہی پڑے گا۔

دیکھا خزاں میں ہم نے بلبل کے آشیاں کو
دو چار پر شکستہ، دو چار استخواں تھے

میں بھی کہ انسان کہلاتا ہوں۔ مثل ایک پھول ہی کے ہوں اور صرف چند دن کا مہمان:

ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی
مثالِ بو اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا

امیر!! جفائے آسماں کی داستانیں، جو چاہو کہ سنو تو۔ ۔ ۔ ۔

سنو گورِ غریباں کی زباں سے

عزیز احباب رفقیٰ، دم لے میں سب چھوٹ جاتے ہیں
جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

پھر اس کے بعد ہم کہاں، عزیز و اقارب کہاں، ہائے یہی تو بات تھی جو۔ ۔ ۔ ۔

مل کے اک اک گور سے ہم دیر تک رویا کئے
لے گئی عبرت جو کل گورِ غریباں کی طرف

یہ تمام آرزوئیں، ساری تمنائیں جو پر نہ آئیں ساتھ قبر میں جاتی ہیں افسوس کام کرنے کا جو ہے انسان کم ہی کرتا ہے۔ تم بھی نہ رہو گے اور ہائے اس وقت کی بیکسی!! سمجھ لو کہ اچھا نہ رہے۔ پھر دیکھو تو لاش پر عبرت کیا کہتی ہے امیر؟! پوچھتی ہے کہ "آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے؟" چاہئے کہ تم بھی ہر بے خبر راہ رو سے کہو:

اک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے
او غریبوں کے مزاروں سے گذرنے والے

آنے جانے والے ٹھہر ہی جایا کریں گے۔ کچھ یاد ان کو آیا ہی جایا کرے گا۔ عبرت امیر بڑی چیز ہے جو انسان پکڑ لے۔ کہہ دو کہ انسان ہی نہیں سارا جہان فانی ہے۔ آج ہم مٹے ہیں تو ایک قبر نئی بنی ہے۔ کل تک یہ بھی شاید نہ رہے لوح مزار پر کھدوا دو کہ:

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

بے شک

اَللّٰہُ بَاقِیْ مِنْ کُلِّ فَانِیْ

---

(۱)

وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر
شعر جو اِنتخاب ہوتے ہیں

جاری ہے لین دین یہ رسمِ زمانہ ہے
دریا کا ابر، ابر کا دریا خزانہ ہے

○

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

○

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہُو پکارے گا آستیں کا

○

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیرؔ
کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

جولانِ سمند رو دلِ پرو : دے مجھے
اے سوزِ عشق ہمّتِ مردانہ دے مجھے

لو عفوِ معاصی کی لگائے رہیں عاصی
رحمت کو بہت آتے ہیں بخشش کے بہانے

عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و فغاں کی
پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

○

سمجھا ہیں یہ جو نکلے، شاخوں سے گُل چمن میں
صوفی نکل کے بیٹھے خلوت سے انجمن میں

○

تو ہی بتا کھٹکا نہ اے باغباں ہمارا
کس شاخ پر چمن میں تھا آشیاں ہمارا

○

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری قسمت کی کوتاہی تری ہمت کی پستی ہے

○

سخی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا
مگر جو کسی کو دیا لے گیا

○

سرد آہیں جب کسی نے لیں وطن یاد آ گیا
چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آ گیا

○

ذکرِ ہُو، کس دلِ وحشی نے کیا ہے کہ امیر
وہی آواز چلی آتی ہے ویرانے سے

ارباب کمال چل بسے سب

کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں — دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
ارباب کمال چل بسے سب — سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں
محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ حال اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

زانو پہ امیرؔ سر کو رکھے
پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں

ہم اپنی خاک سے بعدِ فنا یہ کام لیتے ہیں
غبارِ راہ بن کر ان کا دامن تھام لیتے ہیں

رہو تم شوق سے عہدِ شباب و دورِ مستی میں
ہم اپنے سر بلائے گردشِ ایام لیتے ہیں

(غیر مطبوعہ)

○

تند مے اور ایسے کمسن کے لئے
ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا
ہم برے سب سے ہوئے جن کے لئے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

کون ویرانے میں لوٹے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے

لاش پہ عبرت یہ کہتی تھی امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

○

انھیں درکار ہے ایک چلبلا دل
یہ سننا تھا کہ بجلی بن گیا دل

دہائی بادشاہِ حسن کی ہے
ادائیں چھینے لیتی ہیں مرا دل

الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں
وہاں تو مانگتی ہے ہر ادا دل

امیرؔ اس نازنیں ظالم نے دیکھا
نگاہیں بول اٹھیں وہ لے لیا دل

○

رہی اے گُلِ سبک رُوحوں کو تیری جستجو برسوں
پھرا کی کو بکو پیراہنِ یوسف کی بُو برسوں

فنا کے بعد ایسے بیکسوں کو کون پوچھے گا
مگر اے بیکسی رونا کرے گی ہم کو تو برسوں

امیرؔ اک مصرعۂ تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں

○

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے　　زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے　　ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے
خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا　　تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے
تری بانکی چتون نے چن چن کے مارے　　نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے
یہاں درد سے ہاتھ سینے پہ رکھا　　وہاں ان کو گزرے گماں کیسے کیسے
ہزاروں برس کی ہے بڑھیا یہ دنیا　　مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے
بنا کر دکھائے مرے دردِ دل نے　　تہِ آسماں آسماں کیسے کیسے
ترے جاں نثاروں کے تیور وہی ہیں　　گلے پر ہیں خنجر رواں کیسے کیسے

امیر اب سخن کی بڑی قدر ہوگی
پھلے پھولیں گے نکتہ داں کیسے کیسے

○

رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے — قربان ہونے والے کے قربان جائیے

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے — کیا ہے ہمارے دل میں بھلا جان جائیے

مانی ہیں ہم نے سینکڑوں باتیں تمام عمر — آج آپ ایک بات مری مان جائیے

خنجر کمر سے کھینچ کے گردن پہ رکھ دیا — اور بولے اب تو کہہ تمہے قربان جائیے

اچھا ہوا کہ حضرتِ دل واں دھرے گئے — کس نے کہا تھا بن کے نگہبان جائیے

محشر میں بھی شہیدِ محبت کو ہے یہ رٹ — اک ہاتھ اور بھی ترے قربان جائیے

کیا ہند میں کمی ہے مے و معشوق کی امیر

شیراز جائیے نہ خراسان جائیے

○

گلشن میں سرو، فوج میں مثلِ نشاں رہے
عالم میں سربلند رہے ہم جہاں رہے

نیرنگ ان کی شانِ تجلّی کے دیکھیے
اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے

یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہو گئے تمام
کشتی میں جیسے ساکنِ کشتی رواں رہے

تا حشر ان کو نازِ مبارک نیاز
مانندِ عشق حسن بھی یا رب جواں رہے

صیّاد ادھر خلاف، ادھر باغباں امیر
ہم بار خدا اِ قفس و آشیاں رہے

○

جتنی کمی کہ نامہ سیاہی میں رہ گئی
اتنی ہی دیر عفوِ الٰہی میں رہ گئی

ابلیس ادھر کھنچتا تو مرا دل ادھر کھنچا
دو ہاتھ چل کے رہزن و راہی میں رہ گئی

اللہ رے انقلاب محل ہے نہ قصر ہے
زینت فقط عمارتِ شاہی میں رہ گئی

صد شکر منہ سے نامِ محمدؐ نکل گیا
بات اپنی بارگاہِ الٰہی میں رہ گئی

پردے سے اس کی ذات کو کیا کام تھا میرؔ
چھپ کر صفاتِ لامتناہی میں رہ گئی

عدم کو جاتے ہیں ہستی سے قافلے کیا کیا

سیاہ اشک کی آنکھوں نے کی ہے تیاری
کہو کہ نیزۂ مژگاں کرے عمل داری

زمانہ آپ کو شاید حسیں سمجھتا ہے
کہ جانتا ہے سبب فخر کا دلآزاری

عدم کو جاتے ہیں ہستی سے قافلے کیا کیا
یہ شاہراہ شب و روز رہتی ہے جاری

ادھر جو تیر ادھر تن پہ تیغ پڑتی ہے
کہاں کہاں کی بھلا ہو سکے خبرداری

ادھر مکان بنا اور ادھر مزار کھدا
ادھر لباس ادھر ہے کفن کی تیاری

وہ خوش خرام ہوئے خاک جن کے ماتم میں
زمیں پہ سر کو پٹکتے ہیں کبک کہساری

لحد میں ان پہ پڑا بوجھ سینکڑوں من کا
کسی کی جن سے نہ ہوتی تھی ناز برداری

کہاں وہ ذکر زلیخا، کہاں وہ شاہیٔ مصر
کہاں وہ حضرت یوسف کی گرم بازاری

کہو کہ آئیں نہ اس کے فریب میں عاقل
کہ باغ سبز دکھاتا ہے چرخ زنگاری

یہی حقیقت دنیا ہے گر تو کیا دنیا
کسی سے کی نہ کرے گی کبھی وفاداری

مسافر اس میں روانہ ہیں آنکھ بند کئے
عدم کی راہ میں دیکھو ہے کتنی ہمواری

نُدرتِ خیال

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

○

ہوائے گل اسے کہتے ہیں اے بلبل کہ جنگل میں
لئے پھرتا ہے ہر طاؤس ساتھ اپنے گلستاں کو

○

تو وہ بت ہے کہ تجھے ساری خدائی چاہے
بندہ اللہ سے کس کس کی برائی چاہے

○

وار خالی نہ گیا قاتل کا
بچ گیا میں تو قضا لوٹ گئی

○

کھا کے تلوار جو فریاد و فغاں کرتا ہوں
لذتِ زخم رقیبوں سے نہاں کرتا ہوں

○

جو چاہیے سو مانگئے اللہ سے امیرؔ
اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال سے

معانی آفرینی و نازک خیالی

نہ اٹھا بوجھ زندگانی کا   کچھ ٹھکانا ہے ناتوانی کا

○

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم   جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

○

شمع کہتی ہے یوں پتنگوں سے   کہو! پہلے سے کون جلتا ہے

○

یہی عالم ہے حیرت کا تو نظارہ کہاں مجنوں   نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلیٰ ہے محمل پر

○

بالائے آسماں تھے ہم عرش آشیاں تھے   کوئی نہ تھا وہاں تھے اب اپنا کہیں نہاں تھے

○

پردہ انھیں سے ہے جنھیں تاب نظر نہیں
آتے ہیں خود وہ دیکھنے والوں کے سامنے

سراپا

آنکھوں کے آگے آ کے کھڑی ہو گئی وہ شکل　　دم بھر جہاں پلک سے پلک آشنا ہوئی

وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بے ساختہ پن کی
سنورنے سے بگڑتے ہیں بگڑنے سے سنورتے ہیں

میرے حق میں ہر طرح ہے یار کی چتون غضب　　قہر کی چتون قیامت پیار کی چتون غضب

حسن کھلتا ہے سینوں میں جیسے تیغ نگاہ　　جس قدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

مسکرایا وہ اس ادا سے امیر　　میں تو سمجھا کہ اب گری بجلی

سینکڑوں لالہ رخ و سرو قد و غنچہ دہن　　دیدنی ہے چمن عالمِ امکاں کی بہار

بہار

(۱)

فصلِ گُل آئی ہوا گلزارِ جنّت بوستاں
بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں دماغِ باغباں

ہر طرف گلہائے رنگارنگ گلشن میں کھِلے
جیسے صبحِ عید یک جا ہوں حسینانِ جہاں

خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر
کر رہے ہیں سجدۂ شکرِ خدائے انس و جاں

قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار
جی اُٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں

جھوم کر آیا ہے ابر کوہساری باغ میں
رقص میں ہے ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نگہت گل میں بھی ہے کیف شراب ارغواں
لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست
نرگس شہلا نے رکھی مے فروشی کی دکاں
داربست تاک میں خوشے نظر آنے لگے
جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فراز آسماں
ہر روش پر بیٹھی ہے بزاز بن کر خرمی
جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں
فیض شبنم سے ملے اشجار کو آبی لباس
بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آب رواں
یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہال سایہ دار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسین دامن کشاں

جان پھولوں میں پڑی زندہ ہوئی خاکِ چمن
ہے دمِ جاں بخش عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں

جس طرف دیکھو زرِ گل باغ میں انبار ہے
شکلِ فوّارہ اگلتی ہے زمیں گنجِ نہاں

غنچہ و سوسن سے کیا ہو شکرِ احسانِ بہار
وہ زبانِ بے دہن ہے یہ دہانِ بے زباں

مصر کا بازار کہئے باغ کے بازار کو
گُل ہے یوسف گرد اس کے بلبلوں کا کارواں

جس کی کرتے ہیں پرستش جس کی کرتے ہیں طلب
ان مکانوں میں ہے پوشیدہ یہاں ہر سو عیاں

آئینہ خانہ ہے گلشن آئینہ ہے برگ برگ
جلوہ گر ہے ہر طرف رنگِ بہارِ بے خزاں

بہار

(۲)

لائی ہے کیا چمن میں ہر اک شاخسار پھول
دکھلا رہے ہیں باغِ جناں کی بہار پھول

کتنے ہیں سرخ و سبز تو کتنے سپید و زرد
ہر رنگ میں ہیں صنعتِ پروردگار پھول

آراستہ چمن میں ہے کیا لشکرِ بہار
کتنے پیادہ آتے ہیں کتنے سوار پھول

سیمیں تنانِ چرخ جو چاہیں معاوضہ
بدلیں کبھی نہ پیرہنِ زرد رنگ پھول

وہ نشّۂ سرور کہ جمشیدِ وقت ہیں
شبنم کو جانتے ہیں مئے خوش گوار پھول

توڑے سے زر کے کم نہیں ہر گلبنِ چمن
اس میں درم ہزار تو اس میں ہزار پھول

چھیڑیں شگوفے آپ ہی بلبل کے سامنے
کچھ آپ ہی ہنسی سے ہوں بے اختیار پھول

کلیوں میں ہیں کوچے کوچے میں پھولوں کا ہے فرش
اس درجہ بچھ گئے ہیں زمیں پر ہزار پھول

عالم کو کر لیا ہے احاطہ بہار نے
پھیلے ہیں کاشمیر سے تا شہرِ زار پھول

کثرت ہے اس قدر کہ سخی باغباں ہوا
دیتا ہے مفت اہلِ تماشہ کو ہار پھول

برسات

(۱)

ذوقِ مے نوشی بڑھاتی ہے گھٹا برسات کی
اور بے اُڑتی ہے مستوں کو ہوا برسات کی

اے پری اس فصل میں سرگرمِ آرائش نہ ہو
آگ تلووں میں لگاتی ہے حنا برسات کی

ابر، دریا، سبزہ، ساقی، یار، مطرب، دخترِ رز
ہو یہ سب ساماں تو پھر دیکھیں فضا برسات کی

شیرۂ انگور کو کرتی ہے آب آتشیں
آگ پانی میں لگاتی ہے ہوا برسات کی

برق چمکاتی ہوئی کہسار سے اُٹھی نہیں
نیمچے کھینچے ہوئے آئی گھٹا برسات کی

رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نوعروسانِ چمن
پتے پتے سے ٹپکتی ہے ادا برسات کی

میکدے میں بوتلوں کے منہ سے اڑ جاتے ہیں کاگ
ہوش مستوں کے اُڑاتی ہے ہوا برسات کی

زاہدوں کی توبہ ٹوٹی لڑکھڑایا پائے شیخ
کچھ عجب مستانہ رُت ہے ساقیا برسات کی

شوخیاں ہیں دخترِ رز کی کہ بجلی کی چمک
بوتلیں ہیں مے کی یا کالی گھٹا برسات کی

دختِ رز سے کہہ دے کوئی اور کھینچ لے چار دن
فصل آ پہنچی ہے او ناآشنا برسات کی

ٹکریں لیں ابر سے مستوں نے پی پی کر شراب
کیا بلا ہوتی ہے مستی ساقیا برسات کی

پتے پتے پر ہے ساقی سبزۂ مینا کا رنگ
کیا نظر آتی ہے سبزی خوش نما برسات کی

میکشوں کے منہ سے جو اس فصل میں نکلی دعا
لے اڑی بابِ اجابت کو ہوا برسات کی

ہر روش پر ہو چمن میں اک پری ساغر بکف
ایک دن یوں دیکھیں اے ساقی فضا برسات کی

ہجر میں سب بے مزہ ہے وصل میں سب با مزہ
فصل گرمی کی ہو یا جاڑے کی یا برسات کی

جب چمن میں آ گیا مستوں کو ساون کا خیال
ساونی گاتی ہوئی آئی گھٹا برسات کی

مور ناچے، کوئلیں کوکیں پپیہے بول اُٹھے
وصل کے دن آ گئے فصل آئی کیا برسات کی

کیا تری زلفِ سیہ کو دیکھ کر شرما گئی
بھیگی بھیگی رات ہے اے مہ لقا برسات کی

برسات

(۲)

تند پُر شور سیہ مست زکہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

ہر روش اور ہی ساماں نظر آتے ہیں   جانِ تازہ گل و نسریں و سمن پاتے ہیں
جھومتے ہیں جو شجر سرد ہوا کھاتے ہیں   رقص کرتے ہوئے طاؤس بھی چلّاتے ہیں

تند پُر شور سیہ مست زکہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

لو تماشائے گل و سنبل و سوسن کو چلو   دیکھنے شاہدِ مقصود کے جوبن کو چلو
سیر کا وقت ہے گرداں کے دامن کو چلو   بیٹھنا گھر میں مناسب نہیں گلشن کو چلو

تند پُر شور سیہ مست زکہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

کرتے ہیں مرغِ چمن شور گھٹا چھائی ہے ہر روش ناچتے ہیں مور گھٹا چھائی ہے
لطف برسات ہے پُرزور گھٹا چھائی ہے صحنِ گلزار میں گھنگھور گھٹا چھائی ہے

تند پرشور سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

زینتیں مے کی دکانوں کی خداداد ہوئیں اور چاہیں تو بلیں ایسی کہ پری زاد ہوئیں
خاطریں قیدِ غمِ دہر سے آزاد ہوئیں بھٹیاں بادہ فروشوں کی بھی آباد ہوئیں

تند پرشور سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

چاہیئے دورِ مے ناب ہو پیمانہ چلے جس جگہ بھی ہو تو میکش سوئے میخانہ چلے
مقدرت ہو کہ نہ ہو کام چلے یا نہ چلے زرِ جیب تک کے چلے بادۂ مستانہ چلے

تند پرشور سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

طرفہ اس ابر کی ہے زیرِ فلک جلوہ گری ہم سمجھتے ہیں کہ پر تول کے آئی ہے پری
زاہدِ خشک بھی دیکھیں گے تماشائے تری کشتِ امید ہوئی بادہ گساروں کی ہری

تند پر شور سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

رُخ جو ہیں زرد وہ گلنار نظر آئیں گے   جتنے زہّاد ہیں میخوار نظر آئیں گے
لالہ رُو مائل آزار نظر آئیں گے   زعفراں زار چمن زار نظر آئیں گے

تند پر شور سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

محاکات و منظر نگاری

آئیں پہن پہن کے نئے گلبدن لباس   یارب ہزار رنگ کے بدلے چمن لباس

○

ہر کلی کہتی ہے کھل کر ترے دیوانے سے   دیکھ نکلی ہے پری سج کے پری خانے سے

○

عجب دلچسپ نقشہ عالم ایجاد رکھتا ہے   جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اسے دل یاد رکھتا ہے

○

امیر صانع قدرت کا کھیل ہے دنیا
بنا بنا کے مٹائی ہیں صورتیں کیا کیا

شوق و مستی

چلے ساقی! ہنسے بولے اگر آئی ہے یاروں میں
دلہن بن کر نہ بیٹھے دخترِ رز بادہ خواروں میں

○

ساقی! ہوں تیری بزم میں میں تشنہ جگر بھی
صدقے تری آنکھوں کے کوئی جام ادھر بھی

○

ساقیا! جاتے ہیں پیاسے ترے میخانے سے
گھونٹ دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے

○

میں بڑا نامست ہوں جنت مرا کاشانہ تھا
حور ساقی چشمۂ کوثر مرا پیمانہ تھا

○

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

○

امیر اچھا شگونِ مے کیا ساقی کی فرقت میں
جو برسا ابرِ رحمت جائے مے شیشے میں بھر رکھا

وارفتگی اور اندازِ والہانہ

ارے بانکے! یہ تیغِ ابروئے خمدار کیسی ہے
پڑے ہیں اس میں لاکھوں بال یہ تلوار کیسی ہے

○

او کمان ابرو! ادھر بھی سرسری کوئی نگاہ
تیر کے مشتاق ہم بھی ہیں نشانے کی طرح

○

ظالم تجھے دل دیا خطا کی
بس بس میں پہنچ گیا سزا کو

○

مرے ہی سامنے دامن اُٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ اُلٹا مرے چاکِ گریباں کا

چھیڑ چھاڑ

قیامت ہے واعظ اسی تاک میں — ادھر تو نے پی اور اُدھر آگئی

○

قاضی کو شوق بادہ کشی کا ہے ان دنوں — بنت العنب پڑی ہے عجب پارسا کے ہاتھ

○

یہ سمجھ کر کبھی ناصح کی بھی سن لیتا ہوں
اک نہ اک بات نکل آتی ہے سو باتوں میں

○

کل ذرا چپ مرے پاس آکے جو بیٹھا ناصح
میں یہ سمجھا کہیں کمبخت اسے دیکھ آیا

○

پوچھتا میں جو مسیحا کہیں مجھ کو ملتے — دردِ دل کی بھی تمھیں کوئی دوا آتی ہے

○

مومنی سے کہہ دو طور پہ جایا کریں نہ روز — اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

بانکپن اور شوخی

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

○

تنے اتنے بنے ہو کچھ نئی تلوار باندھی ہے
نگاہِ حسرت آلودہ نہیں دیکھی ہے بسمل کی

○

اُن کو آتا ہے پیار پہ غصہ   مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

○

روٹھنا روز کا ٹھہرا ہے تو یہ سن رکھئے
روز کے روٹھنے والے کو منانے بھی نہیں

○

کمر لچکتی ہے، خنجر سنبھل نہیں سکتا   اور آپ آئے ہیں عاشق کے امتحاں کیلئے

عشق

(غیر مطبوعہ)

محیطِ زمین و زماں عشق ہے — زمیں عشق ہے آسماں عشق ہے
محبت کا دریا بلا خیز ہے — جو موج اس کی ہے تیغِ خونریز ہے
کہوں کیا میں طوفاں بڑا فرق ہے — یہاں کشتیِ نوح بھی غرق ہے
بڑھی بیقراری حجاب اُڑ گیا — عجب خواب تھا جس سے خواب اُڑ گیا
چھپائے سے چھپتا ہے کب رازِ عشق — کہ بے زخمہ بجتا ہے خود سازِ عشق
یہ وارفتۂ شوقِ دیدار تھے — تجلّی کے موسیٰ طلبگار تھے
سنا نامِ بلقیس حیراں ہوئے — جو دیکھا تو عاشق سلیماں ہوئے
عجب عاشقی کے ہیں انداز ناز — کہ محمود ہے خود غلامِ ایاز
ہوا اہل یہ محو ہوائے دمن — کہ پوچھا نہ پھر کچھ سوائے دمن
جہاں شمع ہے گرد پروانہ ہے — پری کو جو دیکھا ہے دیوانہ ہے
گلوں پر ہے یوں بلبلوں کا ہجوم — قمر پر ہو جیسے ہجومِ نجوم
اسی سوز سے دل میں لالے کے داغ — اسی بو سے سنبل پریشاں دماغ

کبھی نافۂ چینِ گیسو بنا — کبھی سرمۂ چشمِ جادو بنا
زبانِ تیزِ منصور کے کام میں — مئے تند جمشید کے جام میں
کھنچی اس کی شمشیر خوں ہو گیا — پڑا اس کا سایہ جنوں ہو گیا
کہیں کارفرما کہیں کارساز — کہیں روح فرسا کہیں جاں گداز
کہیں خندہ زن خندۂ گل کے ساتھ — کہیں نالہ کش آہِ بلبل کے ساتھ
کہیں شانۂ موئے آشفتگاں — کہیں بسترِ راحتِ خفتگاں
ترِ پردۂ چشمِ برقِ جلال — حسینوں کے چہرے پہ نورِ جمال
تغیر کبھی ہے بحالی کبھی — لبالب کبھی ہے تو خالی کبھی
سرِ راہ بیٹھا کہیں بن کے گرد — کسی دل میں اٹھا کہیں ہو کے درد
کہیں شام سے کوئی روتا رہا — کوئی شب کو سوتے کا سوتا رہا
کسی ماہ کا یہ شتر بنہ کیا — گلوں کی طرح چاک سینہ کیا
کوئی مہر قیدِ محن میں چھپا — کوئی ماہ طلعت گہن میں چھپا
غرض یہ تلاطم ہے ہر لہر میں — یہ آشوب برپا ہے ہر شہر میں

ہوئے اس کے ہاتھوں بہت گھر خراب
کئے اس نے کشور کے کشور خراب

مثنوی

یہ امیر مینائی کی ایک طویل تصنیف "مثنوی اردو" بھی ہے۔ غیر مطبوعہ ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "اختر نگر کے سہاگ کی یادگار ہے"

ابواب کی تقسیم اور موضوع کے انتخاب میں وہی رنگ اختیار کیا گیا ہے جو میر حسن اور مرزا شوق نے اختیار کیا۔ کہانی بیان کی گئی ہے ایک شہزادے اور ایک شہزادی کی جو ایک دوسرے کو خواب میں دیکھتے ہیں اور عاشق ہو جاتے ہیں۔ چند سے مصیبتوں اور مشکلوں کا سامنا رہتا ہے۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ معرکے سر کئے جاتے ہیں۔ عشق در در پھراتا ہے۔ دشت و بیاباں کی خاک چھنواتا ہے بارے بعد خرابی بسیار وصل نصیب ہوتا ہے۔ ماں باپ بھی دونوں کے آملتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

شروع میں حمد اپنے میں سارے انداز اور نظریات تصوف لئے ہوئے ہے اور جگہ جگہ نہایت مرغوب ہے۔ فرماتے ہیں۔

بہر جا کہ نوریست از نور اوست ۔۔۔ بہر سو کہ برقیست از طور اوست

اسی کا یہ جلوہ ہے چاروں طرف ۔۔۔ ہزاروں نشاں ہیں ہزاروں طرف

وہ اوّل کہ جس کی نہیں حد کہیں ۔۔۔ وہ آخر کہیں جس کا آخر نہیں

زمانے میں سب کچھ ہے اَلّا شریک ۔۔۔ وہی ہے وہی وحدہٗ لاشریک

اسی ایک نے سب کو پیدا کیا ۔۔۔ یہ سب کارخانہ ہویدا کیا

مہ و مہر سے آسماں تابناک ۔۔۔ گلوں سے لبالب گریباں چاک

یہ نیرنگیاں لاابالی نہیں — کوئی پردہ نغمے سے خالی نہیں
یہ سب پردہ ساز اسرار ہیں — صدا ایک ہے سینکڑوں تار ہیں
سوا اس کے کوئی یگانہ نہیں — ہمیشہ وہی ہے زمانہ نہیں
جہاں پر تو نورِ جانانہ ہے — یہ محمل نہیں آئینہ خانہ ہے
جو مطرب نوازندہ ساز ہے — ہر اک ساز میں اس کی آواز ہے
توافق تخالف میں پایا گیا — عجب ایک ساگر بنایا گیا
رہِ فہم دل بھولتا ہی نہیں — شناور کا دم پھولتا ہی نہیں
چمن پر ہی موقوف ہے کیا فضا — کہ ہر بزم میں اک چمن ہے بپا
ہوا زلف و رُخ کا برابر ظہور — کہ بے سایہ ممکن نہ تھی قدرِ نور
نمی ہے صنعتِ خالقِ روز و شب — جدھر دیکھئے ہے تماشہ عجب
نہالوں کو ایسا سرِ معرفت — کہ ہے ہر ورق دفترِ معرفت
پری رو سمن سینہ نازک بدن — قدِ راست شمشاد غنچہ دہن
اسی کا ہے جلوہ سما تا سمک — اسی کا ہے پرتو زمیں تا فلک
وہی مادہ اور وہی صلب سنگ — تماشائے قدرت ہے تبدیل رنگ
ریاحیں ہوں یا نخلِ لیل و نہار — اُسی سے ہیں رحمت کے امیدوار

کسی سر پہ تاجِ شہی دھر دیا کسی سنگ کو آئینہ کر دیا

شجر ایک گل ہائے تر نو بنو

نہال ایک اس کے ثمر نو بنو

حمد طویل ہے اگرچہ رب العزت کی شان میں جو جتنا کہے کم ہے۔ میں نے صرف چند اشعار بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کئے ہیں۔ شروع کے اشعار بالخصوص خالقِ ہستی و حقیقتِ اشیا اور وجود باری تعالیٰ سے متعلق ان کے گہرے مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔ خاص طور پر یہ کہ

سوا اُس کے کوئی یگانہ نہیں ہمیشہ وہی ہے زمانہ نہیں
زمانے میں سب کچھ ہے لا شریک وہی ہے وہی وحدہٗ لاشریک
جہاں پر تو روئے جانانہ ہے یہ محفل نہیں آئینہ خانہ ہے

آخر میں بیانِ قدرتِ کاملہ کی نیرنگی کا اپنے دل پذیر انداز میں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:

وہی مادہ اور وہی قلبِ سنگ تماشائے قدرت ہے تبدیل رنگ
شجر ایک گلہائے تر نو بنو نہال ایک اس کے ثمر نو بنو

یہ مثنوی کوئی بہت اعلیٰ پایہ نہیں لیکن جا بجا مضامین مرغوب، بندشیں چست۔ اشعار بے ساختہ اور دلنشیں۔ افسوس ہے اردو زبان پر کہ اس نے اور تو سب کچھ فارسی شاعری سے لے لیا لیکن مثنوی کو اس طرح نہ اپنایا، جیسا اس کا حق تھا۔ حالانکہ اپنے تنوع، جامعیت اور تعدد خیال کی گہرائی و وسعت میں فارسی زبان کا بہترین سرمایہ مثنوی ہے۔ ایک مثنوی مولوی معنوی تصوف و حقائق نگاری کی جان ہے تو دوسری شاہنامہ فردوسی رزم کا پورا سامان۔ ایک رومی کو زندۂ جاوید کر گئی تو دوسری فردوسی کو۔ نظامی و جامی، سعدی و خسرو اور فیضی وغیرہم متعدد گرامی پایہ شعرائے فارسی کی مثنویاں رزم و بزم کے وہ وہ نقشے کھینچ کھینچ کر دکھلا گئی ہیں کہ باید و شاید۔ ہماری زبان کے اہلِ نظر نے اس تنوع کو تو رکھ دیا طاق پر اور بن رہے لکیر کے فقیر۔ چاہیے تھا کہ میر حسن و دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق کے بعد یا ان سے پیشتر اس وسیع

میدان کی پوری پیمائش کی جاتی۔ کیوں نہ تصوف و اخلاق کے سارے درس اس میں دے دیے گئے؟ کیوں نہ فطرت کی بڑی بڑی حقیقتوں کو اس میں بیان کیا گیا، کیوں نہ افکار کی گہرائیوں کو تصورات کی رفعتوں کو، خیالات کی ساری گوناگونیوں اور وسعتوں کو اس میں کھولا گیا نہ ہو کر آئندہ بھی ہمارے اہلِ کمال اس پہلو کو بھولے رہیں۔ ہاں تصوف و حکمت کا بیان بھی اردو مثنویوں میں ہوا ہے لیکن کتنا؟ اور کیسا؟ کیا وہ ہماری شاعری کا بہترین... مکمل نمونہ قرار پا سکتا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ نہیں۔

اسی مثنوی اردو میں امیر مینائی ایک جگہ باغ کی تعریف کرتے ہیں:

گلستاں گلستاں گل سرخ و زرد
پری بوٹہ بوٹہ ہوا سرد سرد

شہزادے نے جب شہزادی کو خواب میں دیکھا اور جاگ کر اسے نہ پایا تو پھر سے

نہ تن کی خبر تھی نہ جامے کا ہوش ۔۔۔ سراسیمہ بیتاب خانہ بدوش
نہ کھانا نہ پینا نہ سونا کبھی ۔۔۔ کسی شے سے واقف نہ ہونا کبھی
وہ غم دل نے کھایا کہ خوں ہو گیا ۔۔۔ پری کو جو دیکھا جنوں ہو گیا
ملازم نہ ہمراہ ساماں لیا ۔۔۔ فقط توشۂ داغِ ہجراں لیا
قدم سخت رکھا رہِ سخت پر ۔۔۔ توکل خدا پر نظر بخت پر

حال شہزادی کے حسن کا بیان کرتے وقت کہتے ہیں کہ:

صراحی گلا، نرگس مست جام ۔۔۔ بدن حسن کا میکدہ تھا تمام

اس نے بھی جمالِ بہار آرا شہزادے کا دیکھا تو بس یہ حال ہوا کہ

طبیعت کی صورت بدلنے لگی — چھری سی کلیجے پہ چلنے لگی
طبیعت کو گو روکتی تھی کمال — بہت دل کو سمجھاتی تھی خستہ حال
مگر اختیار پری رو نہ تھا — کسی طرح کا دل پہ قابو نہ تھا
کوئی لا کے صندل سنگھانے لگی — کوئی دست و پا کو دبانے لگی
کہ اس میں ذرا اس کی جھپکی پلک — تلاطم میں نیند آگئی یک بیک
پھر اس کو نظر آگیا خواب میں — وہی آشنا موج و گرداب میں
صدا اس نے دی اس کو بے اختیار — کہ او رہزنِ ملکِ صبر و قرار

کدھر کو چلا ہے مجھے کرکے زار
کہ دل صورتِ موج ہے بیقرار

شہزادے نے کہا

تری جستجو میں ہوں خانہ خراب — یہ کشتی کا تختہ یہ دریائے آب
یہ بولی اُتر آ کہ حاضر ہوں میں — پریشاں بہت تیری خاطر ہوں میں
وہ بولا کہ کشتی پہ کیا اختیار — خدا ناخدا ہو تو بیڑا ہو پار
نہ دل پاس ہے اور نہ تو ساتھ ہے — فقط وصل کی آرزو ساتھ ہے

شہزادے نے

ارادہ کیا قصدِ جاں کیجئے کھنچے تیغِ الفت تو سر دیجئے

کھلی ناگہاں آنکھ اس خواب سے

پڑا اک نڈیں چھپ کے گرداب سے

واسوخت

(وہ طرزِ کلام جس سے ایک پورا دور معنون ہے)

اردو شعر و ادب میں "واسوخت" کا مقام خاص ہے۔ لکھنوی شعرا کے واسوخت
اس دور میں شہری معاشرت کی چلتی پھرتی تصویریں ہوتی تھیں۔ واجد علی شاہی لکھنؤ کچھ آج
کے پیرس سے ملتا جلتا تھا ــ شعر و ادب کا گہوارہ۔ عیش و عشرت کا مسکن، دولت
و حشمت کا مرکز۔ بے فکروں اور عاشق مزاجوں کا مامن ـــ واسوخت میں اسی معاشرت
کی عکاسی کی جاتی تھی اور کوئی شاعر مشکل ہی سے استاد مانا جاتا تھا۔ جب تک اس
صنف میں بھی کامیاب نہ رہا ہو اس لئے اچھے اچھے ثقہ حضرات بھی اس میں طبع آزمائی
کو عیب نہ جانتے تھے۔ چنانچہ امیر مینائیؒ نے بھی غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر یعنی
بالکل شروع جوانی میں کئی واسوخت لکھے جو مشہور ہوئے، بار بار چھپے اور میر انیس
جیسے باکمال سخن اور سخن سنج سے انھیں سندِ قبولیت عطا ہوئی۔ یہاں اس مجموعے سے
چند بند منتخب کر کے پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ اہلِ نظر کو امیر مینائیؒ کا اصلی رنگِ شاعری
متعین کرنے میں سہولت ہو۔ یہی رنگ تھا جو غزلوں کا روپ دھار کر ابتدائی دور میں
"غیرتِ بہارستان" بنا اور آخری دور میں "صنم خانہ عشق"۔

لکھنؤ کا رنگِ شاعری اپنے اجزائے ترکیبی میں ایک حد تک دلّی کا مرہونِ منت

ہے۔لیکن اس سے کہیں زیادہ چوکھا اور پُرفن۔ امیر مینائیؒ نے جب قدما کا
تتبع کرتے کرتے اپنا طرز الگ بنانا چاہا تو اسی بنیادی لکھنوی رنگ سے انھیں
بڑی مدد ملی۔ اس میں چند اجزا انھوں نے نئے شامل کئے اور چند کو یک قلم
نکال پھینکا۔ ان کے اپنے رنگ میں آمیزش ایک طرف میرؔ و مصحفیؔ کے رنگ کی
ہے تو دوسری طرف آتشؔ جرأتؔ اور انیسؔ کی۔ سوانح عمری میں، جو ابھی زیر طبع ہے
اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اہلِ نظر وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

دھوم ہے خسرِ اقلیمِ فن آتا ہے
فوجِ غم ساتھ ہے آمادہ خوں آتا ہے
خلل انداز صفِ صبر و سکوں آتا ہے
صاحبِ لشکرِ نیرنگ و فسوں آتا ہے
قابلِ دید تماشہ حشم و جاہ کا ہے
داخلہ تختِ گہِ دل میں شہنشاہ کا ہے

وہ فلک قدر شہنشاہِ زمن کون؟ کہ عشق
تیغ زن تیر فگن قلعہ شکن کون ؟ کہ عشق
رستمِ معرکۂ رنج و محن کون ؟ کہ عشق
مالکِ ملکِ دل و جان و بدن کون کہ عشق

گرد میں ہے روشِ بادِ بہاری دیکھو
حضرتِ عشق کی آتی ہے سواری دیکھو

خستہ میں کشتہ ہیں جس کی وہ ستم گر ہے یہی
پہلواں جس نے پچھاڑے وہ دلاور ہے یہی
ڈوبتے جس نے نکالے وہ شناور ہے یہی
کشتیاں جس نے ڈبوئیں وہ سمندر ہے یہی

خضر کا غرق ہے یاں آج نہیں کل بیڑا
نوح لائیں جو سفینہ نہ لگے نخل بیڑا

عشق عشاق کو رسوائے جہاں کرتا ہے
صاحبِ ضبط کو سرگرمِ فغاں کرتا ہے
چشمۂ چشم سے سیلاب رواں کرتا ہے
زرد چہرہ صفتِ برگِ خزاں کرتا ہے
نوجواں خم صفتِ پیرِ کہن سال ہوئے
سینکڑوں باغِ جوانی تھے جو پامال ہوئے

دل لگاتے ہی ہزاروں کو پڑی جانوں کی
سینکڑوں چھان چکے خاک بیابانوں کی
دھجیاں اُڑ گئیں کیا کیا نہ گریبانوں کی
جس جگہ دیکھئے ٹکڑی ہے پریشانوں کی
کچھ عجب بزم ہے یہ لوگ جہاں ہوتے ہیں
چار سر پھوڑتے ہیں چار کھڑے روتے ہیں

پھاڑ کر کپڑے ہوئے جامے سے باہر کتنے
چھان کر خاک ہوئے خاک برابر کتنے
تشنہ لب ڈوب مرے چاہ میں گر گر کتنے
غرقِ دریا ہوئے تھک تھک کے شناور کتنے

دب رہا کوئی سیہ خانۂ زنداں کے تلے
کوئی روتا ہے کسی نخلِ بیاباں کے تلے

شدتِ جوشِ جنوں سلسلہ جنباں پھر ہے
الاماں خاطرِ ناشاد پریشاں پھر ہے
دامنِ وادیٔ وحشت میرا داماں پھر ہے
جادۂ دشت مرا چاکِ گریباں پھر ہے

موجِ اشکوں کی نظر آتی ہے زنجیر مجھے
پیچ تقدیر کا ہے طوقِ گلوگیر مجھے

کشورِ دل میں جہاندار ہوا خسروِ عشق
مالکِ دولتِ بیدار ہوا خسروِ عشق
رونق افزا، سرِ دربار ہوا خسروِ عشق
تاج کا تخت کا مختار ہوا خسروِ عشق
نام خطبے میں کیا شاہ نے اپنا جاری
کشورِ دل میں ہوا داغ کا سکّہ جاری

خواہشِ جلوۂ معشوق ہوئی پہلو کو
حسرتِ زانوئے محبوب ہوئی زانو کو
دھیان آیا دلِ سودا زدہ گیسو کو
سونگھنے چل کے کسی کا گلِ عنبر بو کو
عمر بے صحبتِ محبوب کٹے خوب نہیں
زیست کا لطف بجز صحبتِ محبوب نہیں

انھیں دنوں ایک مصوّر تصویریں بیچتا ہوا اِدھر آنکلا۔ ان میں سے ایک پر:

آگئی ایسی طبیعت کہ کہا گھبرا کر
کس کی تصویر ہے یہ کون ہے یہ رشکِ قمر
جس چمن کا ہے یہ گُل ہے وہ چمن زار کدھر
واہ کس برجِ سعادت کا یہ چمکا اختر
اس شباہت کے کہاں ماہ جبیں ہوتے ہیں
قدرت اللہ کی ایسے بھی حسیں ہوتے ہیں

روشنی دُور ہوا پر نظر آئی مجھکو
شکلِ آئینہ مقدّر نظر آئی مجھ کو
شمعِ دولت جو منوّر نظر آئی مجھ کو
جان تک جامے سے باہر نظر آئی مجھ کو
روشنی دُور سے جتنی وہ قریب آتی تھی
جان ہوتی تھی ہوا، بوئے حبیب آتی تھی

پھر جب وہ آ گیا اور اُسے دیکھا تو مبہوت ہو گئے

ملک آیا ہے کہ اُتری ہے فلک سے کوئی حور؟
یا پری قاف سے آئی میری آنکھوں کے حضور؟
بے ستوں پر یہ ہوا جلوۂ شیریں کا ظہور؟
دیکھنا قیس کا لیلیٰ کو ہوا یا منظور؟
زہرہ آئی کہ قمر برجِ قمر سے نکلا؟
دوسرا مہر جہاں تاب کدھر سے نکلا؟
دونوں جانب سے ہوئیں طالبِ دیدار آنکھیں
نیچی نظریں نہ رہیں ہونے لگیں چار آنکھیں

اس کے بعد وصل نصیب ہوا۔ دن رات عیش میں بسر ہونے لگے:

اس کو اور مجھ کو خبر کچھ نہ زمانے کی رہی۔
دل کو خواہش کہیں آنے کی نہ جانے کی رہی
روز ترکیب محبت کے بڑھانے کی رہی
نئے سامان طرب شام و سحر ہونے لگے
عشرت و عیش میں دن رات بسر ہونے لگے

تھا بہت وضع کا پابند جو وہ پردہ نشیں
گھر میں رہتا تھا فقط ذہن نہ جاتا تھا کہیں
ایک دن پاکے اُداس اس کو برائے تسکیں
عرض کی میں نے کہ اے مہر لقا ماہ جبیں

کیوں پریشان رہا کرتے ہو کاکل کی طرح
زیست ہنس بول کے کاٹو گل و بلبل کی طرح

دوستانہ جو یہ ترکیب اسے سمجھائی
شغل پیدا ہوا اور اس پہ طبیعت آئی

محفلیں ساز و نغمے کی گرم ہونے لگیں جہاں ہم سنوں ہم نشینوں کے ساتھ
کبھی رونا کبھی ہنسنا کبھی گانا کبھی جنگ
مستی و بیخودی و کیف کا پھیلا ہوا رنگ
داستاں لب پہ کسی کی کبھی وحشت کی ترنگ
فکرِ ناموس تھی مستوں کو نہ اندیشۂ ننگ

اشک آنکھوں سے گراتا کبھی باراں کی طرح
جھومتا نشے میں اشجارِ گلستاں کی طرح

ایک سے ایک بغل گیر کبھی مستی میں
آئینہ صورتِ شمشیر کبھی مستی میں
لب پہ بہلی ہوئی تقریر کبھی مستی میں
خامشی صورتِ تصویر کبھی مستی میں

بوسے لینا کبھی جھک جھک کے لبِ ساغر کے
ہاتھ کاندھے پہ کبھی ساقیِ مہ پیکر کے

عاشقانہ کبھی اشعار سنانا رونا   مثنوی میر حسن کی کبھی گانا... رونا

ہم نشینوں سے یہ کہنا کہ کہو رنگِ جہاں
کون ہے باغ میں گل کس کا ہے قدِ سروِ رواں
شہر میں کتنے حسیں عشق کا چرچا ہے کہاں
کون کس پر ہے فدا کون ہے کس پہ قرباں

ہم نشینوں کا یہ کہنا کہ کہے کیا کوئی
آپ ہی آپ ہیں بس اب نہیں ایسا کوئی

ہمنس نے کہنا کہ ہٹو!! جھوٹ بناتے ہو ہمیں
فقرے دیتے ہو یہ فقرے جو سناتے ہو ہمیں
باندھنی ہے جو ہوا تم کو اُڑاتے ہو ہمیں
ذرّے ہیں مہرِ جہاں تاب بتاتے ہو ہمیں
تم سے سیمیں بدن و ماہ جبیں ہوں گے بہت
کارخانہ ہے خدائی کا حسیں ہوں گے بہت

ہم نشینوں کا یہ کہنا، انھیں قدموں کی قسم
جھوٹ کہتے ہوں اگر آنکھوں سے معذور ہوں ہم
ہیں تو دو چار حسیں اور بھی پر آپ سے کم
سامنے آئیں تو گردن ہو ابھی شرم سے خم
روبرو چاند کے تاروں میں صباحت توبہ
مہر کے سامنے ذرّوں کی حقیقت توبہ

اس طرح ہم نشینوں نے اسے پہلے مغرور بنایا پھر بہکایا اور عاشق کی طرف سے التفات اس کا کم ہو گیا۔ اس تک جب یہ خبر پہنچی کہ اصل میں آپ سے تعلق اب نہ رہا، کسی دوسرے کے ہو رہے ہیں۔ تو رنج بہت ہوا پر پوری طرح یقین نہ آیا۔ تب جنھوں نے خبریں پہنچائی تھیں ثبوت بہم پہنچانے کے لئے ایک محفل میں لے گئے کہ لو خود دیکھ لو۔ عاشق نے وہاں پایا کہ:

خوبرو جشن میں نزدیک کے اور دور کے ہیں
نورؔی بزم میں سب بزم نشیں نور کے ہیں

ایک نقال نے اس وقت جو کی نقل عجیب
قہقہہ مار کے چلمن میں ہنسا تب وہ حبیب
پہنچی اس شوخ کی آواز جو کانوں کے قریب
ہو گیا دل کو یقیں ہے یہ وہی وائے نصیب

کان سنتے ہی جو آواز کو پہچان گئے
وہی خورشید ہے اس ابر میں ہم جان گئے

غصّے اور رنج کے عالم میں چلے

دھیان تھا جسم میں اب جان رہے یا کھو جائے
صبح کے ہوتے ہی جو کچھ بھی ہے ہونا ہو جائے
طرفہ نیرنگ تلوّن کہیں دکھلاتا تھا
ایک رنگ آتا تھا رخسار پہ اک جاتا تھا

وہ ظالم آیا تو صبح کو ہم نے پاس بُلایا، بٹھایا اور انداز بیان یہ اختیار کیا کہ :

ابر غم خاطرِ ناشاد پہ جو چھایا ہے
ایک احوالِ گزشتہ ہمیں یاد آیا ہے

یہ سن کر کہ کہانی غم کی ہے وہ بھی ملول ہوا اور کہا کہ :

رازِ دل دوست سے کرتے نہیں کیا دوست بیاں
دل تمہارا جو ہے بیتاب ہمیں تاب کہاں
مدتوں عیش کیا، قصّۂ غم بھی تو سنیں
کہیے کہیے وہ خدا کے لئے ہم بھی تو سنیں

تنگ ہو کر یہ کہا ہم نے کہ کیا خاک کہیں
کچھ جو رونے سے تھمیں دیدہ نمناک کہیں
تم یہ خواہاں ہو کہ حالِ دلِ بیتاب کہیں
ہم یہ کہتے ہیں کہ کیا گردشِ افلاک کہیں
یہی مرضی ہے تو لو سوزِ جگر کہتے ہیں
گرچہ کہنے کا نہیں حال مگر کہتے ہیں

یادِ ایام کہ شوخی کا یہ انداز نہ تھا
غمزہ خوں ریز نہ تھا ہوش ربا ناز نہ تھا
قاتل اندازِ نگاہِ غلط انداز نہ تھا
برقِ جاں سوز ترا شعلۂ آواز نہ تھا
ایسی کب گرمیٔ بازار رہا کرتی تھی
بھیڑ کس دن، پسِ دیوار رہا کرتی تھی

یا یہ تھا رنگ کہ جاتا تھا اگر سوئے چمن
آنکھ نرگس سے چراتا تھا تو اسے غنچہ دہن
چھوتی تھی نکہتِ گلشن بھی جو تیرا دامن
صاف آجاتی تھی پیشانیٔ روشن پہ شکن
دمِ گلگشت جو لگتی تھی ہوا گلشن کی
بیکلی ہوتی تھی کلیوں کو ترے دامن کی

یا یہ عالم ہے کہ بے پردہ ہوا ماہِ تمام
جمع ہیں لوگ چکوروں کی طرح گرد مدام
طرفہ تر یہ ہے کہ آنکھوں میں نہیں شرم کا نام
انقلابِ فلکِ سفلہ ہے عبرت کا مقام
دیکھنے کو ہیں ترستے جو تجھے تکتے تھے
گھورتے ہیں وہ جو آنکھیں نہ ملا سکتے تھے

جان بچنے کی نہیں اور تو صورت زنہار
ہاں مگر ہم بھی کہیں اور لگائیں دلِ زار
نہ سمجھنا کہ نہیں ہم سا کوئی لالہ عذار
شاہدِ مصر سے خالی نہیں کوئی بازار
گزرا اپنا بھی حسینانِ پری زاد میں ہے
ایک سے ایک حسیں عالمِ ایجاد میں ہے

حسنِ صورت پہ نہ مغرور ہو ایسا کوئی
جُز خداوندِ دو عالم نہیں یکتا کوئی
نہ سمجھنا کہ نہیں خلق میں ہم سا کوئی
ابھی خالق کی خدائی میں نہیں کیا کوئی

ہم نے بھی کسی اور کو ڈھونڈ نکالا ہے جس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ :

اس مُرقعے کو عجب بخشی ہے تنویر اس نے
ایک سے ایک پرے کھینچی ہے تصویر اس نے

ساغرِ بادۂ گُل رنگ ہے آنکھوں پہ نثار
مستئ حسن سے سرمست ہوئے ہیں ہشیار
ڈورے آنکھوں میں نہیں جمع ہوئے ہیں میخوار
صاف ہے چہرۂ رنگین پہ گلستاں کی بہار
مست سمجھیں جو وہ آنکھیں نظر آئیں کالی
گھر کے آئیں ہیں گلستاں پہ گھٹائیں کالی

توسنِ طبع ہمارا بھی ہے کیا زور آور
چشمِ وحشی کی صفت میں نہیں تھکتا دم بھر
کسی صیاد نے برچھوں میں ہرن گھیرے ہیں
چوکڑی بھرنے پہ آمادہ ہیں رُخ پھیرے ہیں

ایسا مضمون بندھے بینی و ابرو کا کہ واہ
نوبتیں بجنے لگیں سب کہیں سبحان اللہ
چاندنی رات ہے افشاں سے وہ گیسوئے سیاہ
دیکھتے ہوں جیسے تارے وہ کرے خوب نگاہ

واہ کیا شکلیں ہیں قابل ہیں یہ تصویروں کے
دیکھو نکلی ہے زرہ چھاؤں میں شمشیروں کے

ایسی شوخی پہ عجب حال ہے مجھ سے اس کا
میں فدا اس پہ ہوں وہ میری طرح مجھ پہ فدا
مہرِ سینے میں، نگاہوں میں حیا، دل میں وفا
دل کی صورت نہیں ہوتا میرے پہلو سے جُدا

مجھ سے برگشتہ تیری طرح وہ محبوب نہیں
اس کو مطلوب نہیں جو مجھے مطلوب نہیں

الغرض میں نے سنائی جو انھیں یہ تقریر
مارے غصے کے ہوا پھول سا چہرہ تغیّر
غیرتِ حسن نے دکھلائی یہ اپنی تاثیر
پہلے تو ہو گئے خاموش برنگِ تصویر

پھر برس پڑے اور کہا

چشمِ بد دُور نیا یار مِلا ہے ان کو
ہم سے بہتر کوئی دل دار مِلا ہے ان کو
کوئی یوسف سرِ بازار مِلا ہے ان کو
جان بیچیں گے خریدار مِلا ہے ان کو
اسی یوسف سے دلِ زار لگائیں گے یہ اب
پوچھنا کیا ہے مزے خوب اُڑائیں گے یہ اب

شانِ اللہ کی یہ اور بھلائیں گے ہمیں
راستہ بھولے ہوئے راہ دکھائیں گے ہمیں
آشنا غیر کے ہوں گے یہ ستائیں گے ہمیں
ہم جو آنے کو کہیں گے، نہ بلائیں گے ہمیں
ہیں ابھی سے یہ زمانہ تہ و بالا کرتے
پوچھتا کوئی جو ان کو تو کہو کیا کرتے

ہم سے بہتر کوئی محبوب !! خدا کی قدرت
ہم بُرے اور وہ خوش اسلوب !! خدا کی قدرت
وصل اس کا انہیں مرغوب !! خدا کی قدرت
ہم سے نفرت ! یہ بہت خوب !! خدا کی قدرت

پاؤں کل پڑتے تھے، کچھ آج سرِ دِ کار نہیں
چھوٹے سے منہ کو بڑی بات سزاوار نہیں
خیر صاحب وہی گلفام مبارک ہو تمہیں
ہم ہوئے خار !!. گل اندام مبارک ہو تمہیں

لیکن وار بھرپور پڑا تھا، محبوب جو ابھی تک سخت مشتعل تھا، یکایک آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کہا ؎

بدگمانی ہوئی، کچھ قدر نہ جانی میری
خوب سمجھا میں، کہی تم نے کہانی میری

تم نے اس وقت سنایا جو فسانہ سچ ہے
مہماں آپ کا اُس بزم میں جانا سچ ہے
پیچھے چلمن کے وہاں مجھ کو بھی پانا سچ ہے
جھوٹ پھر جھوٹ ہے سچ ہم نے بھی مانا سچ ہے

چشمۂ صاف میں لوثِ خس و خاشاک نہیں
پاک دامن ہے جو انسان تو کچھ باک نہیں

لو سنو صاف، نہیں اب کوئی پردے کا مقام — جھوٹی باتوں کا بنانا کسی چھوٹے کا ہے کام
وہ مرا گھر تھا جہاں آپ گئے تھے سرِ شام — میرے بھائی تھے وہ شہزادے یہ ہے راست کلام

میری بہنوں سے منوّرہ وہ پریخانہ تھا
بھائیوں سے مرے آباد وہ کاشانہ تھا

اُس کے کہنے سے ہوا سخت تحیّر کا مقام — خوب تحقیق کیا اس کو تو تھا راست کلام

ڈال کر ہاتھ گلے میں یہ کہا جرم معاف
بدگمانی تھی فقط اپنی بچشمِ انصاف

یارب اجابت احباب کی نظروں سے گریں
دن پھرے جیسے مرے ویسے زمانے کے پھریں

انتخابِ کلام

(ردیف وار)

الف

○

مرے بس میں یا تو یا رب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

ترا میکدہ سلامت ترے خُم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اترتا مجھے کیوں خمار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دمِ رخصت ان کا کہنا کہ یہ کاہے کا ہے رونا
تمھیں میری قسموں کا بھی نہیں اعتبار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

ترے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا
نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو جگر کے پار ہوتا

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا

مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشان تک نہ رکھا
میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیرؔ باقی
انھیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا

○

اے فلک یہ رُت یہ متوالی گھٹا
اب تو راتیں ہجر کی کالی گھٹا

لائے ساقی کو بھی متوالی گھٹا
کچھ مزہ دیتی نہیں خالی گھٹا

تم بھی جوڑا کھول دو وہ آ گئی
بال کھولے گیسوؤں والی گھٹا

گل نہیں پھولے چمن میں لائی ہے
میکشوں کی نذر کو ڈالی گھٹا

جان پر توبہ کی ٹوٹیں بجلیاں
خوب برسی بجلیوں والی گھٹا

کچھ تو ہو اے چرخ برسے یا کھلے
کیسی ہے اِمسال جنجالی گھٹا

کیا گلے ملتی ہے متوالوں سے آج
کھول کر آغوش متوالی گھٹا

گورے گورے گال تیرے بجلیاں
کالی کالی کاکلیں کالی گھٹا

دل پہ غم چھایا ہے بدلی کی طرح
اے مرے مولا مرے والی گھٹا

لوٹتے ہیں سانپ سینے پر امیر
دیکھ کر فرقت کی شب کالی گھٹا

○

کچھ غم نہیں جو پیش ہے دفترِ قصور کا ‏ ‏ عنوانِ نامہ نام ہے ربِّ غفور کا
محروم اُس کے خوانِ تجلّی سے کون ہے ‏ ‏ حصّہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا
ہمت ہے شرطِ راہِ خدا ہے کھلی ہوئی ‏ ‏ پہنچا وہ جس نے قصد کیا راہ دُور کا
کہتے ہی یا کریم اِدھر سے اُدھر گئے ‏ ‏ لطف و غضب میں فاصلہ تھا کتنی دور کا
وہ صاف دل ہوں مردمکِ چشم کی طرح ‏ ‏ میرے سیاہ خانہ میں عالم ہے نور کا
عاشق کیا ہے شوق نے تیرے حبیبؐ کا ‏ ‏ یارب امیدوار ہوں عفوِ قصور کا
دیدار کا تو وعدہ وفا ہوگا حشر کو ‏ ‏ ارشاد ہو علاج دلِ ناصبور کا

میں خاک بھی ہوا تو ہوا اس کی خاکِ در
چھوٹا نہ دستِ عجز سے دامن غرور کا

○

میں پرانا مست ہوں جنّت مرا کاشانہ تھا
حور ساقی چشمۂ کوثر مرا پیمانہ تھا

حسنِ مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا
لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر
تھا انا الحق حق مگر اک حرفِ گستاخانہ تھا

اس قدر اس کے تصوّر نے ستایا ہے مجھے
شبہ ہوتا ہے کہ ہستی میں کبھی تھا یا نہ تھا

گُل سراپا گوش بنتے کیوں نہ سننے کے لئے
چھپے گلشن میں بلبل کے ترا افسانہ تھا

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخِ حرم
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا

آزما دیکھا اسے سو بار ہم نے اے امیرؔ
آشنا سے آشنا بیگانے سے بیگانہ تھا

○

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزہ جاتا رہا
سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا
مجھ کو گلیوں میں جو دیکھا چھیڑ کر کہنے لگے
کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا
کیا بری شے ہے جوانی رات دن ہے تاک جھانک
ڈر بتوں کا اک طرف خوفِ خدا جاتا رہا
آنے والا جانے والا بیکسی میں کون تھا
ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا
نیند بھی فرقت میں کھا بیٹھی ہے آنے کی قسم
خواب میں بھی دیکھنے کا آسرا جاتا رہا

جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا
تم گلے سے کیا ملے سارا گلہ جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیرؔ
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا ، جاتا رہا

○

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا — جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا
باہم جو ذکرِ زلفِ شکن در شکن ہوا — برہم تمام سلسلۂ انجمن ہوا
نعم البدل دیا مجھے اللہ نے امیرؔ — دل ہو گیا جو خون تو رنگیں سخن ہوا
سو عکس آئنے میں پڑے اور مٹ گئے — اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا
راتوں کو کی امیرؔ یہ ذکرِ خفی کی مشق — دل بن گیا زبان تو سینہ دہن ہوا
کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب — پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا
اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن — یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا

خلوت میں تھا تو شاہدِ معنی تھا میں امیرؔ
خلوت سے انجمن میں جو آیا سخن ہوا

○

حریم کوچۂ قاتل کی راہ گر لینا
سمندِ عمر سے او شہسوار اُتر لینا

جگر سے اُٹھتے ہیں شعلے کہ دل سے اے ہمدم
کدھر یہ آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

یہ مجھ کو دیکھ کے ہوتا ہے حکم بانکوں کو
بچے جو تیغ سے تم برچھیوں پہ دھر لینا

وہ چھیڑنے کو مرے مسکرا کے کہتے ہیں
کہاں چمک کے یہ بجلی گری خبر لینا

امیرؔ جاتے ہو بُت خانے کی زیارت کو
پڑے گا راہ میں کعبہ سلام کر لینا

مزہ عاشق کے دل سے پوچھ حسنِ شعلہ رویاں کا
تماشا دیکھ پروانے کی آنکھوں سے چراغاں کا

مرے ہی سامنے دامن اُٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ اتنا مرے چاکِ گریباں کا

تمہارے بانکپن کی شان کچھ اس میں نکلتی ہے
کھنچے تو دوڑ کر منہ چوم لوں شمشیرِ عریاں کا

امیر آئیں گے کیا کیا شعلہ رو راتوں کو چھپ چھپ کر
نیا انداز ہوگا میرے مدفن پر چراغاں کا

اُچھلتا ہے کلیجہ ڈوبتا ہے دل خدا حافظ
سمندر تیرنا ہے جھیلنا شبہائے ہجراں کا

بڑے نادان ہیں جو لوگ ڈرتے ہیں امیر اس سے
اجل تو نام ہے اک زندگانی کے نگہباں کا

○

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

خضرِ دلِ مقصود اگر دل نہیں ہوتا
منزل کا پتہ سینکڑوں منزل نہیں ہوتا

دریائے محبّت سے جو پار اُتریں وہ جانیں
ہوتا ہے خدا جانے کہ ساحل نہیں ہوتا

اُٹھنے کو کہے کوئی تو بن جاتی ہے جی پہ
اس بزم میں جانا مجھے مشکل نہیں ہوتا

فریاد بھی کرتا ہوں تو اللہ سے اپنے
اس در کے سوا میں کہیں سائل نہیں ہوتا

یہ شعر وہ فن ہے کہ امیرؔ اس کو جو برتو
حاصل یہی ہوتا ہے کہ حاصل نہیں ہوتا

○

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا
کہ ذرّہ ذرّہ ہے آئینہ خود نمائی کا
دراز عمر ہو مشاطۂ تصوّر کی ۔
مزہ وصال کا دیتا ہے غم جدائی کا
طریقِ عشق میں گم ہو کے پہنچے منزل پر
عجیب راستہ سوجھا ہمیں رسائی کا
یہ کس کی راہ میں کھوئے گئے کہ ہم سے خضر
طریق پوچھتے ہیں آکے رہنمائی کا
بشر سے حمدِ الٰہی امیرؔ کیا ممکن
پہاڑ اُٹھائے کہاں حوصلہ یہ رائی کا

○

جمالِ یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا
کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا
وہی چراغ وہی گُل وہی قمر وہی برق
نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا
فنا ہے حسن کو دولت کو زندگانی کو
جہاں میں نہ کوئی باغِ بے خزاں دیکھا
پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے
کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا
کجھلی چتونیں آنکھوں میں کیا جگہ میں چھپیں
امیرؔ آج عجب نوک کا جواں دیکھا ،

○

فراقِ یار نے بے چین ہم کو رات بھر رکھا
کبھی تکیہ ادھر رکھا کبھی تکیہ ادھر رکھا

برابر آئینے کے بھی نہ سمجھے قدر وہ دل کی
اسے زیرِ قدم رکھا اُسے پیشِ نظر رکھا

نہ کی کس نے سفارش میری وقتِ قتل قاتل سے؟
کماں نے ہاتھ جوڑے تیغ نے قدموں پہ سر رکھا

ترے نقشِ پا کو رہگزر میں سجدہ کر بیٹھے
جہاں تو نے قدم رکھا وہاں ہم نے بھی سر رکھا

امیر اچھا شگونِ مے کیا ساقی کی فرقت میں
جو برسا ابرِ رحمت جامِ مے شیشوں میں بھر رکھا

○

غنی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا
مگر جو کسی کو دیا لے گیا

بڑی پیچ در پیچ تھی راہِ دَہر
خدا ہم کو لایا خدا لے گیا

گیا سامنے یار کے میں تو یوں
کہ ہاتھوں سے دل کو سنبھالے گیا

بظاہر رہا مجھ سے غافل مگر
کنکھیوں سے وہ دیکھے بھالے گیا

بہت تھے اسیرانِ زندانِ ہوش
جنوں آ کے سب کو چھڑا لے گیا

○

دل گیسوؤں میں ہم سے پھنسایا نہ جائے گا
اس چاند کو یہ داغ لگایا نہ جائے گا
دل میں خیال آنکھوں کا لایا نہ جائے گا
مے خانہ گھر خدا کا بنایا نہ جائے گا
کہتا ہے دل چھپاؤں گا میں خوب رازِ عشق
آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں چھپایا نہ جائے گا
کیوں یاس توڑتی ہے مرے دل کا آسرا
یہ گھر اُجڑ گیا تو بسایا نہ جائے گا
لاکھوں کو خاک میں تو ملا دے گا آسماں،
ظالم سے دو دلوں کو ملایا نہ جائے گا

امیر لاکھ ادھر سے اُدھر زمانہ ہوا
وہ بُت وفا پہ نہ آیا میں بے وفا نہ ہوا

ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی
برنگِ بو ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا

قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھُلے
جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہوا

نہ پوچھ ناز و نیاز اُس کے میرے کب سے ہیں
یہ حسن و عشق تو اب ہے اسے زمانہ ہوا

خدا کی راہ میں دنیا ہے گھر کا بھر لینا
ادھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

○

ہر جگہ جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو جگر میں داغ دل میں غم ہوا

ہوں میں وہ غم دوست غم نے جب کمی کی غم ہوا
کی شکایت چرخ سے جس روز صدمہ کم ہوا

رازداریٔ محبت کا میں کیا دعویٰ کروں
جس قدر محرم ہوا اتنا ہی نامحرم ہوا

میں ترا ممنون ہوں اے گریۂ بے اختیار
جب پڑی مجھ پر مصیبت تو شریکِ غم ہوا

○

تھا دھیان میں نقشہ جو تری جلوہ گری کا
منہ پھیر لیا دیکھ کے رُخ ہم نے پری کا

ہر صبح کو یہ شور ہے مرغِ سحری کا
چونکو کہ زمانہ نہ رہا بے خبری کا

دیتا ہے خبر پر خبر احباب کا اُٹھنا
پر وہ نہیں اُٹھتا ہے مگر بے خبری کا

میخانہ میں دورِ مئے گلرنگ نہیں ہے
اندر کے اکھاڑے میں ہے یہ رقص پری کا

یاد آتا ہے گلزار میں اس گل کا وہ سونا
آنا وہ دبے پاؤں نسیمِ سحری کا

○

میری طرح نہ اک دن ابرِ بہار رویا
وہ ایک بار رویا میں لاکھ بار رویا

مجنوں سے میں نے پوچھا کل حال بیخودی کا
کچھ کہہ سکا نہ منہ سے پر زار زار رویا

کیا بے کسی کا عالم میرے مزار پر ہے
جو آگیا وہ بن کر شمعِ مزار رویا

آواز دے رہے ہیں مقتل میں زخمِ بسمل
خنداں ہوا جو پہلے انجامِ کار رویا

پوچھی امیرؔ سے کل میں نے جو دل کی حالت
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر بے اختیار رویا

○

یہ شکوہ بیوفائی کا یہ رونا کج ادائی کا
بُرا ہے دل لگانے کی مزہ ہے آشنائی کا

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بُت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شانِ کبریائی کا

نیا افسانہ کہہ واعظ تو شاید گرم ہو محفل
قیامت تو پرانا حال ہے روزِ جدائی کا

امیرؔ اس خرقہ و عمامہ کو تم رہن مے کر دو
ابھی تم پر نہیں پھبتا یہ جامہ پارسائی کا

○

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا
اے عالم آشنا جو ترا آشنا ہوا

زائل ہوئی نہ بھیس بدلنے سے بوئے عشق
تصویر میں بھی رنگ ہے رخ سے اڑا ہوا

انساں کی مرگ و زیست نہیں ہے کسی کے ہاتھ
آئے تو کیا جو آپ نہ آئے تو کیا ہوا

پوچھتا ہے ہیں خون مرا کر کے کیوں حضور
اب اُس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

○

کچھ نہ پوچھو دلربا مجھ سے جدا کیونکر ہوا
دیکھ دل سا آشنا نا آشنا کیونکر ہوا
اے مسیحا میرے دشمن ہوں شفا سے ناامید
تو سلامت درد میرا لا دوا کیونکر ہوا
پوچھ لے قاتل زبانِ تیغ سے سب سرگزشت
کشتے کس منہ سے بتائیں کیا ہوا کیونکر ہوا
داورِ محشر کو بھائی میری اس کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا مکرّر کیا ہوا کیونکر ہوا

○

روکے اس شوخ سے قاصد مرا رونا کہنا — ہنس دیے اس پہ تو پھر حرفِ تمنا کہنا
کیسے ناداں ہیں جو اچھے کو برا کہتے ہیں — ہو برا بھی تو اسے چاہیئے اچھا کہنا
پڑھتے ہیں دیکھ کے اس بت کو فرشتے بھی درود — مرحبا صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ کیا کہنا
چستیِ طبع سے استاد کا ہے قول امیر
موزوں میں سست بھی تو چاہیے اچھا کہنا

○

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا
درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

آفریں کہنے سے رُک جاتا ہے قاتل میرا
لذّتِ قتل گھٹاتا ہے بڑھانا دل کا

مشربِ عشق میں کیسی ہیں یہ اُلٹی باتیں
دل کے جانے کو کہا کرتے ہیں آنا دل کا

ہر نگہ وصل میں اس شوخ کی کہتی ہے امیرؔ
ہو جسے حکم اڑا لے وہ خزانہ دل کا

○

نورِ وحدت سے یہ عالم ہے دلِ آگاہ کا
مہر ہے ایک ایک ذرّہ میری گردِ راہ کا

فی الحقیقت غوطۂ بحرِ فنا ہے لا الٰہ
ہے اُبھرنا اس بھنور سے ذکر الا اللہ کا

ہم کہاں دنیا کہاں کچھ یوں ہی دل میں آگئی
دیکھتے چلئے تماشا اس تماشا گاہ کا

عشقِ شیریں میں نہیں فرہاد بھی خسرو سے کم
ایک عالم ہے محبت میں گدا و شاہ کا

○

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

حسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جتنی نگاہ
جس قدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

دیکھ جو کچھ سامنے آ جائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

صانعِ قدرت کی ہے عالم میں صنعت سے نمود
بانکپن نقاش کا ہے بانکپن تصویر کا

○

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا
دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

جب تک کہ چشمِ شوق میں وحدت کا نور تھا
جس بام پر نگاہ پڑی کوہِ طور تھا

سو شعر ایک جلسہ میں کہتے تھے ہم امیرؔ
جب تک نہ شعر کہنے کا ہم کو شعور تھا

○

سرو آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا
چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا
جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور
جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آگیا
رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا

○

غیروں نے ترا مجھ کو کہا ہو تو کہا ہو — باور انھیں آیا ہو یہ باور نہیں آتا
ناوک کی خطا ہے نہ کماندار کی تقصیر — اے طائرِ دل وقت برابر نہیں آتا
جو مجھ پہ گزرتی ہے کہیں دیکھ لے ظالم — پھر دیکھوں کہ رونا تجھے کیونکر نہیں آتا

○

پہلے تو ایک صفحۂ سادہ تھا آئینہ — دیکھا جو اس نگار نے تصویر ہو گیا
جب میں جوان تھا تو مری شاعری تھی پیر — اب شاعری جوان ہے تو میں پیر ہو گیا
عالم تمام اپنی جوانی سے تھا جوان — ہم پیر کیا ہوئے کہ جہاں پیر ہو گیا

○

نہ بیوفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزہ میں کیا کہوں آغازِ آشنائی کا

فریفتہ ہوں اس اندازِ دلربائی کا
کہ دل لیا تو دیا ذوق آشنائی کا

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

○

حسن بے پردہ سرِ طور پکارا آ کر
چھپتے ہم جب کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

کیا بلا جھوم کے گھنگھور گھٹا آئی ہے
ہائے اس وقت مرا گیسوؤں والا ہوتا

لطف حسرت کی نگاہوں کا تو جب تھا کہ یہ
ان نگاہوں کا کوئی دیکھنے والا ہوتا

○

ہر جام میں ہے جلوہ مستانہ کسی کا
میخانہ ہمارا ہے جلوخانہ کسی کا

ساقی نہ دکھا بہرِ خدا ساغر خالی
لبریز ہوا جاتا ہے پیمانہ کسی کا

کیا تم سے کہوں دل کی خرابی کا میں احوال
برباد ہو اللہ گھر ایسا نہ کسی کا

○

وعدہ نہیں ہے حشر کے دن کس سے دید کا
حصہ ابھی سے بانٹ رہے ہیں وہ عید کا

اس غمکدے میں کٹ گئی یوں اپنی زندگی
قیدی پہ جیسے روز گزر جائے عید کا

آنکھوں میں نور تیرا دل میں سرور تیرا
دروازے سے ہے گھر تک سارا ظہور تیرا
تو مہر تیرے آگے سب قطرہ ہائے شبنم
ان کا کہاں ٹھکانہ جب ہو ظہور تیرا

جھونکا اودھر نہ آئے نسیمِ بہار کا
نازک بہت ہے پھول چراغِ مزار کا
ہمراہ ہے جو حسرت و ارماں کی بھیڑ بھاڑ
تابوت اٹھا امیر غریب الدیار کا

کھلا ہے بابِ اجابت دعا تو کر غافل
درِ کریم سنا ہے کبھی کہ بند ہوا
امیر پائے طلب جب سے توڑ کر بیٹھے
کبھی نہ ہاتھ سوئے اغنیا بلند ہوا

○

کچھ ٹھکانا ہے ناتوانی کا   نہ اٹھا بوجھ زندگانی کا
زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ   آدمی بلبلا ہے پانی کا

○

تصوّر میں زلفوں کے رویا کیا   میں بالوں میں موتی پرویا کیا
عجب قدرتِ حق کھلے اے بتِ بے حِس   کہ مٹی کے پتلے کو گویا کیا

○

شوق خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا   آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا
پیاس اس کی جو بجھے گی تو مئے کوثر سے   ظرف عالی ہے امیر احمد مینائی کا

○

مری تربت پہ اگر آئیے گا   عمرِ رفتہ کو بھی بلوائیے گا

○

غضب ہیں تیری چٹکیاں اے فلک   کلیجہ گلِ نیلوفر ہو گیا
کہاں ہم کہاں در ترا شاہِ حُسن   فقیرانہ یاں بھی گزر ہو گیا

○

دھوم تھی ان کی لن ترانی کی　　کیا کہیں ہم سے سامنا نہ ہوا
کیوں نہ منصور دار پر کھنچتا　　رازداری کا حق ادا نہ ہوا

○

سکہ رائج جب سے دین مصطفیٰ کا ہو گیا
غلغلہ ساری خدائی میں خدا کا ہو گیا

○

مرغ عصیاں اڑ کے صد باز رحمت ہو گیا　　دنگ شاہین ترازو ئے عدالت ہو گیا

○

اب عفو وہ کریں نہ کریں اختیار ہے　　امید عفو میں میں گنہگار ہو چکا

○

صفحہ دہر پہ صورت گر قدرت نے امیر　　اس کی تصویر وہ کھینچی کہ قلم توڑ دیا

○

غم نہیں جی تن سے نکلا دل گیا　　مل گئے تم مجھ کو سب کچھ مل گیا

○

عالم کی سیر آٹھ پہر ہے نصیب امیرؔ — خلوت میں بیٹھے کریں جہاں گرد ہو گیا

○

نہ گل ہنستے نہ غنچے مسکراتے دونوں رو دیتے
تمہیں کو بلبلو آتا نہیں انداز شیون کا

○

بھولنا تھا نہ بہار چمن ہستی پر — رنگ سے بو کی طرح گل کو جدا رہنا تھا

○

ایسا تری رحمت پہ بھروسہ ہے کہ مجھ سے
احسان اٹھایا نہیں جاتا ہے دعا کا

○

ایک ارماں نکلتا ہے تو سو آتے ہیں
دل عجب گھر ہے کہ ہرگز نہیں ویراں ہوتا

○

ہر قدم پہ وادیٔ وحشت میں کہتا ہے یہ دل — المدد اے شوق منزل نہ بنے بیٹھ رہو

○

یارب شبِ وصال یہ کیسا گجر بجا — اگلے پہر کے ساتھ ہی پچھلا پہر بجا

○

ہے کشورِ عدم میں خدا جانے سیر کیا — آیا نہ پھر کے منزلِ ہستی سے جو گیا

○

حوصلہ قیس کا فرہاد کا دل پیدا کر — پھر تو یہ کوہ ہے کس کا یہ بیاباں کس کا

○

اٹھو گلے سے لگا لو مٹے گلہ دل کا — ذرا سی بات پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

○

کیف حاصل ہو، لگے داغ نہ میخواری کا — مستیِ عشق بڑا کام ہے ہشیاری کا

○

کھیل تھا عمر بھر جو دیکھا تھا — زندگی کیا تھی اک تماشا تھا

○

امیر عالمِ قدرت کا کھیل ہے دنیا — بنا بنا کے مٹائی ہیں صورتیں کیا کیا

○

نوجواں لوگ کیا نہیں کرتے　　　دل لگایا تو کیا گناہ کیا

○

ہنستے کھیلتے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیرؔ
دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا

○

دعویٰ کیا تھا گل نے کل اپنے رنگ و بو کا
تھپیڑ صبا نے مارے شبنم نے منہ پہ تھوکا

○

قتل سے ہم رہے محروم گری ہاتھ سے تیغ
ہائے اس آنکھ سے جلاد کو دیکھا کیوں تھا

○

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے　　　کہ ہے ہے ہم کو پھر جینا پڑے گا

○

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا　　　امیرؔ آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

○

کل ذرا چپ مرے پاس آ کے جو بیٹھا ناصح
میں یہ سمجھا کہیں کمبخت اسے دیکھ آیا

○

کچھ آج نہیں رنگ یہ افسردہ دلی کا　　مدت سے یہی حال ہے یارو مرے جی کا

○

دلبری سے کام ہے ہم کو دل آزاری سے کیا
یار کی یاری سے مطلب اس کی عیاری سے کیا

○

[illegible]　　اک دل دیا تھا ہم کو [illegible]

○

[illegible]　　مدِ نظر ہوا ہے مرا آشیانہ کیا

○

لاکھوں ہی اس لیلیٰ کے دیوانے تھے راہِ عشق میں
اک مشتِ استخواں کا نام مجنوں رکھ دیا

یوں ترے در پہ کیوں پڑے رہتے   ہم غریبوں کا گھر اگر ہوتا

تو ہی بتا ٹھکانا اے باغباں ہمارا   کس شاخ پر چمن میں تھا آشیاں ہمارا

گل خود تھے بے ثبات گلستانِ دہر میں
گلچیں غریب مفت میں بدنام ہو گیا

چلے جو آگے بتانے تری گلی کی راہ
ہیں آج خضر سے بھی سخت بدگمان ہوا

ب

○

ہوئے مست دیکھا جو پھولوں کا رنگ — پیالوں میں تھی ارغوانی شراب
خضر ہوں اگر میں تو جا کر پیوں — سر چشمۂ زندگانی شراب

○

آنکھوں آنکھوں میں ہو گئیں باتیں — بے عبارت ادا ہوا مطلب
منہ لگے کون روز ناصح کے — بات سمجھے نہ بات کا مطلب

○

میرے حق میں ہر طرح ہے یار کی چتون غضب
قہر کی چتون قیامت پیار کی چتون غضب

ت

○

ایک ہے میرے حضر میرے سفر کی صورت
گھر میں ہوں گھر سے نکل کر بھی نظر کی صورت

خشک سیروں تنِ شاعر میں لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

○

بات کرنے میں تو جاتی ہے ملاقات کی رات
کیا بری بات ہے رہ جاؤ یہیں رات کی رات

○

شمع پر گزری ہے جو شب تا سحر
مختصر سی ہے ہماری سرگزشت

○

خوشا امیر وہ منعم کہ ہو کے دولت مند
جھکائے سر شجرِ میوہ دار کی صورت

○

مجھ سے مسکیں کے پاس رہتا ہے
کتنا مسکیں نواز ہے غمِ دوست

ٹ

○

کیا اس نگہِ ناز کی چوٹوں میں مزہ تھا
دیکھا کیا آنکھوں سے بچائی نہ گئی چوٹ

ث

○

ہجر میں ہے فضا عبث، ابر عبث، ہوا عبث
بادۂ جانفزا عبث، نغمۂ دلکشا عبث

قافلہ سب ہے پیش و پس پر نہیں کوئی ہمنفس
کون ترا ہے دادرس چیخ نہ اے درا عبث

آئی نہ اپنے کام عمر غم میں کٹی مدام عمر
تکتے رہے تمام عمر صورتِ کہربا عبث

طرفہ اسیرِ غم ہوئے پھر نہ کبھی بہم ہوئے
اس گلِ تر سے ہم ہوئے صورتِ بو جدا عبث

ح

○

آزماؤ دل کو صاحب آزمانے کی طرح
کر دئیں تم تو بدلتے ہو زمانے کی طرح

ایک بار اے برق تکلیف اور کر جھگڑا مٹے
پھونک دے مجھ کو بھی میرے آشیانے کی طرح

او کمان ابرو ادھر بھی سرسری کوئی نگاہ
تیر کے مشتاق ہم بھی ہیں نشانے کی طرح

○

ہے دل میں ٹھنی اب کہ اگر آئے گا ناصح
سمجھاؤں گا ایسے کہ سمجھ جائے گا ناصح

آیا ہے اگر صحبتِ رنداں میں تو بیٹھے
گھبرا کے امیرؔ آپ ہی اُٹھ جائے گا ناصح

○

یہ میکدہ ہے کہ کوئی طلسم ہے ساقی
جو آئے پیر کی صورت گئے جواں کی طرح

خ

○

کہنے کی یہ غزل تو نہ تھی لیکن اے امیرؔ
میں کیا کروں ہے میری طبیعت کا رنگ شوخ

د

○

کون اُٹھائے گا تمہاری یہ جفا میرے بعد
یاد آئے گی بہت میری وفا میرے بعد

جتنا جی چاہے بلاؤں میں پھنسا لو مجھ کو
کوئی پاؤ گے نہ مشتاقِ بلا میرے بعد

میرے مرتے ہی ملا خاک میں وہ اوجِ جنوں
دشت میں کوئی بگولا نہ اُٹھا میرے بعد

نگہِ ناز سے مارا نہ کسی کو اس نے
یار سے کھنچ نہ سکی تیغِ ادا میرے بعد

زینتِ محفلِ اربابِ سخن تھا میں امیرؔ
نہ رہی رونقِ بزمِ شعرا میرے بعد

○

یہ جھک پڑا جہاں وہیں دریا بہا دیا
ساقی مجھے ہے ہمتِ دستِ سبو پسند

○

اپنے مضموں تو پسند آتے ہیں عالم کو امیرؔ
ہے وہ شاعر جو کرے معنیٔ بیگانہ پسند

○

ہے لکھنؤ کی جاں تو کلکتے میں امیرؔ
خاک آئے میری آنکھ کو اب لکھنؤ پسند

○

کیسے ہے وصل کی خواہش ترے خیال کے بعد
کہ حشر تک نہیں پھر ہجر اس وصال کے بعد

ڈ

○

خنجرِ قاتل نہ کر اتنا روانی پر گھمنڈ
سخت کم ظرفی ہے اک دو بوند پانی پر گھمنڈ

عفو کے قابل مرے اعمال کب ہیں اے رحیم
تیری رحمت پر ہے تیری مہربانی پر گھمنڈ

نوبتِ شاہی سے آتی ہے صدا شام و سحر
اور کر لے چار دن اس دارِ فانی پر گھمنڈ

تو سہی کلمہ ترا پڑھوا کے چھوڑوں اے صنم
زاہدوں کو ہے بہت تسبیح خوانی پر گھمنڈ

حال پر اجداد و آبا کے تفاخر کیا امیرؔ
ہیں وہ ناداں جن کو ہے اس قصہ خوانی پر گھمنڈ

س

○

نہ کور باطن ہو اے برہمن ذرا تو چشمِ تمیز وا کر
خدا کا بندہ بتوں کو سجدہ خدا نخواستہ کر خدا خدا کر

ہوا سوا ہم کو جوشِ رقت چمن میں روزِ بہار جا کر
گلوں نے ہنس ہنس کے مار ڈالا رلا یا غنچوں نے مسکرا کر

قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش
کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں ہمیں پھنسا کر

عبث ہے مغرور تجھ کو نخوت نہیں غریبوں کو تیری پروا
خدا ہے ہر مورِ ناتواں کا جو تو سلیماں ہے تو ہوا کر

نہیں ہے کوئی جہاں میں باقی چلے گی اب تیغِ ناز کس پہ
مگر تری قتل گہ میں لائیں مسیح مردے جلا جلا کر

اسی کا ہے رنگ یاسمن میں اسی کی بو باس نسترن میں
جو کھٹکے پتہ بھی اس چمن میں خیال آوازِ آشنا کر

سخنوروں سے معاملہ میں سوائے ذلت حصول کیا ہے
چمن میں بچئے جو ہم سے بلبل تو ہنس پڑے پھول کھلکھلا کر

○

شبیہہ تہِ نظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اترتی
مٹا دیے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

یہ ظلم سارے ہیں چند روزہ ہے ایک دن انتقام کا بھی
امیر حمام گرم کرلیں فقیر کا جھونپڑا جلا کر

امیر قسمت میں جو لکھا ہے اسی کا ہر روز سامنا ہے
خدا ہے مالک خدا ہے رازق کسی سے ہرگز نہ التجا کر

○

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر — سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کوہکن کو بھی شیوۂ عشاق نہیں — ہے جو عاشق دلِ معشوق میں گھر پیدا کر
رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا — نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر
کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں — شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
اپنی گردش پہ بہت ہے تجھے اے چرخ گھمنڈ — جب میں جانوں کہ شبِ غم کی سحر پیدا کر

عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیر
دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

○

سودا فدائے صاحبِ فرمانِ رامپور — ہے رامپور جسم وہ ہے جانِ رامپور
محوِ خرامِ ناز نسیم و صبا نہیں — گلگشت کر رہے ہیں حسینانِ رامپور
گلیاں یہاں کی باغِ ارم کی ہیں کیاریاں — رضواں ہے باغبانِ گلستانِ رامپور

بھولیں گے خلد میں بھی نہ ان کے ادا و ناز
یاد آئیں گے وہاں بھی حسینانِ رامپور

○

مرے پھولوں میں یوں آؤ چمن صدقہ ہو جوبن پہ
ملو ہاتھوں میں مہندی خون سب کا میری گردن پہ
دورنگی سے نہیں خالی ہے کوئی بات اس بت کی
پیامِ صلح لب پر جنگ کے آثار چتون پہ
امیر ایسا کیا ویراں اجل نے قصرِ شاہی کو
کہ آنکھیں رکھ کے روتی بیکسی ایک ایک روزن پہ

○

نوجوانی میں نہ پوچھو رخِ جاناں کی بہار
کچھ عجب موسمِ گل میں ہے گلستاں کی بہار
سینکڑوں لالہ رخ و سرو قد و غنچہ دہن
دیدنی ہے چمنِ عالمِ امکاں کی بہار

○

بتا دے اے فلک تو ہی تعجب ہم کو آتا ہے
کہ خوش ہوتا ہے پھر کیونکر کوئی اندوہگیں ہو کر
بہارِ لالہ و گل پھر کبھی کاہے کو دیکھیں گے
چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہِ واپسیں ہو کر

○

ساقیا ابر ابھی آیا نہیں میخانے پر
کیوں قدح نوش گرے پڑتے ہیں پیمانے پر
ہے وہی دوست جسے جس سے محبت ہو جائے
یہ نہ اپنے پہ ہے موقوف نہ بیگانے پر

○

نہاں تھا آنا کہ ہو نہ ظاہر عیاں تھا جانا کہ سب ہوں ماہر
وہ دل میں آئے امنگ ہو کر گئے تو چہرے کا رنگ ہو کر

غضب ہے انساں دمِ مصیبت کرے جو انساں سے بے وفائی
کہ دیکھو چکی کے پاٹ کیسے بہم ہیں گردش میں سنگ ہو کر

○

رفعتِ قصر تواضع سے اگر واقف ہوں
آئیں پھر خانۂ درویش میں سلطاں جھک کر

یاد رکھ منعم او استاد یہ ہر وقت امیر
دوست دشمن سے ملا چاہئے انساں جھک کر

○

وہ مست جب کبھی گزرتا ہے میکدہ کی طرف
بھاگ کے دستِ سبو جا پڑا ہے ساغر پر

○

قدم جب خوشی نے درِ دل پہ رکھا صدا غم نے دی دیکھنا کہ سنبھل کر

○

کس قدر روشن ہے پھولوں سے شبستاں کی بہار
شاخ ہر گلبن کی ہے سرو چراغاں کی بہار

○

امیر اہلِ شہر ناپُرساں ہے وہ بزم   وہاں تم کیا بناؤ گے بگڑ کر

○

کچھ ادھر بے خبری پیار بھی ہے الفت میں
نہ دل کو تیری خبر ہے نہ تجھ کو دل کی خبر

ط

○

شاعر کو فکرِ شعر میں راحت کہاں امیر
آرام چاہتا ہے تو مشقِ سخن کو چھوڑ

نسما

○

کیا ہوش ربا ہیں تری تلوار کے انداز
سیکھے ہے یہ شاید تری رفتار کے انداز
اک جلوے میں غش کر گئے سارے حضرت موسےٰ
ہوتے ہیں یہی طالبِ دیدار کے انداز؟

○

سرزنشِ بخت میری رہی میری شریک
یا خدا عمرِ شبِ ہجراں دراز

○

نیرنگیٔ عالم میں کبھی فرق نہ آیا
دیکھا تو وہی صبح وہی شام ہے ہر روز

س

○

بے تاب ہجر یار میں اپنا جگر ہے دل کے پاس
بسمل تڑپتا ہو کوئی جیسے کسی بسمل کے پاس

پیری میں اب باقی کہاں ہوش و خرد تاب و تواں
لوٹا گیا یہ کارواں پہنچے جو ہم منزل کے پاس

دنیا سے ۔ حت دُور ہے سرکش عبث مغرور ہے
تاجِ فغفور ہے کاسہ نہیں سائل کے پاس

گردش جو ہو تقدیر میں کچھ سعی بن آتی نہیں
منزل کچھ آگے بڑھ گئی پہنچا جو میں منزل کے پاس

سن جو آیا ہے دل لئے تا چند نہ تو شاد رہے
ناقص نہ پھر ناقص رہے بیٹھے اگر کامل کے پاس

○

آئیں پہن پہن کے سنئے گلبدن لباس
یارب ہزار رنگ کے بدلے چمن لباس

ش

○

کسی کے ساتھ نہ سیدھا چلا یہ کج رفتار
زمانہ ہے کہ تمھاری نگاہ کی گردش

○

سنے شیخ سے امید تو دیدار کا فقیر
اس کو نہ کشف کی نہ کرامات کی تلاش

ص

○

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص
ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص

ض

○

مکاں سے ہے نہ کچھ ہم کو ہے لامکاں سے غرض
جہاں حضور ملیں ہم کو ہے وہاں سے غرض
تمہارے جلوے کے مشتاق ہیں جہاں ہو نصیب
زمیں سے کام نہ کچھ ہم کو آسماں سے غرض
تمہاری ذات سے مطلب ہے دین و دنیا میں
نہ کچھ یہاں سے غرض ہے نہ کچھ وہاں سے غرض
حرم سے کام نہ مطلب ہے دیر سے ہم کو
سرِ نیاز کو ہے تیرے آستاں سے غرض

○

حسین کوئی کہاں ہے ایسا کہ ہوں مناسب تمام اعضا
اسی کا گیسو جواب گیسو اسی کا عارض جواب عارض

ط

○

جانِ بزمِ مے و معشوق غنیمت واعظ
خلد میں ہاتھ نہ آئے گی یہ صحبت واعظ

فیض ساقی سے یہاں پیر جواں ہوتے ہیں
درِ میخانہ نہیں ہے درِ جنت واعظ

تو جو رندوں کی حقیقت نہیں سمجھا نہ سمجھ
[illegible] خوب حقیقت واعظ

بے سبب آج جو پھر ذکرِ مے و جام نہیں
پوچھ تو بات [illegible] لذت واعظ

فصلِ گل میں بھی ہے محروم مے گلگوں سے
دن تو اچھے ہیں بری ہے تری قسمت واعظ

نشۂ بادۂ وحدت کے اٹھائے جو مزے
تو کرے پیرِ خرابات کی خدمت واعظ

مست ہم دخترِ رز کے ہیں وہ حوروں کا اسیر
کبھی سمجھے گا نہ رندوں کی حقیقت واعظ

○

ہجوِ مے کر رہا تھا منبر پر
میں جو پہنچا تو پی گیا واعظ

غ

○

دیکھنا ہمدم یہ بجلی ہے جو چمکاتی ہے تیغ
یا پری کہسار سے نیچے اُترنے آتی ہے تیغ

واہ رے شوقِ شہادت اپنے پہ گرتی ہے آپ
کمزوری ہے کہ دم لینے نہیں پاتی ہے تیغ

ہے پری آنے میں بجلی سے سوا جانے میں ہے
ناز سے آتی ہے اور انداز سے جاتی ہے تیغ

○

یہ اپنی عمر کا عالم ہے عہدِ پیری میں — نسیمِ صبح سے جس طرح جھلملائے چراغ
تمیز ہو کہ نہ ہو شعلہ دل کا آنا ہے — خدائی شان کہ پروانہ آشنائے چراغ

○

جب سے سنا امیر کہ ہیں داغ درد مند
لاکھوں پڑے ہیں سینۂ اہلِ سخن میں داغ

ف

عارض ترے اے گلبدن اک اِس طرف اک اُس طرف
گویا کھلے ہیں دو چمن اک اِس طرف اک اُس طرف

مردہ جو ہیں زیرِ زمیں زندہ ہیں بالائے زمیں،
آراستہ ہے انجمن اک اِس طرف اک اُس طرف

افلاس و دولت دونوں سے دنیا میں ہوتا ہے ضرر
اس سانپ کے ہیں دو دہن اک اِس طرف اک اُس طرف

آدھی سفید آدھی سیہ ہر اک پہ وحشت کی نگاہ
آنکھیں ہیں دو ابلق ہرن اک اِس طرف اک اُس طرف

دل سے جگر سے عشق میں کاٹے سے غم کٹتا نہیں
اک کوہ ہے دو کوہکن اک اِس طرف اک اُس طرف

کیا دن تھے دلّی لکھنؤ تھے میرؔ و مرزاؔ سے چمن
یہ دونوں تھے یکتائے فن اک اِس طرف اک اُس طرف

تلوار ادھر پھیرے ہے منہ بسمل ادھر پھیرے ہے رخ
روٹھے ہیں یہ دولھا دلہن اک اس طرف اک اس طرف

○

مل کے اک اک گور سے ہم دیر تک رویا کیے
لے گئی عبرت جو کل گورِ غریباں کی طرف

○

شوخیاں کہتی ہیں ہم ہیں اس کی چتون کی طرف
چتونیں کہتی ہیں ہم ہیں چشمِ پُرفن کی طرف

ق

○

مرکزِ خاک ہے دُردِ تہِ پیمانۂ عشق آسماں ظرف بر آورد وہ میخانۂ عشق
ہم تھے اور پیشِ نظر جلوۂ مستانۂ عشق جس زمانہ میں نہ محرم تھا نہ بیگانۂ عشق
تم وہ فرہاد تھے کاٹا نہیں صورت سے پہاڑ حسن کا گنج لیا کھود کے ویرانۂ عشق
آرہے باغِ جناں سے جو زمیں پر آدم فی الحقیقت تھی وہ اک لغزشِ مستانۂ عشق
طور پر کہتی ہے یہ شمعِ تجلّی کی زباں سرمۂ حسن ہے خاکسترِ پروانۂ عشق
کیا فلاطوں کو ہے نسبت مرے دیوانے سے آشنا ہے یہ محبت کا وہ بیگانۂ عشق

ہم تھے اور چہرۂ محبوب کا نظّارہ امیرؔ
شعلۂ حسن تھا جس روز نہ پروانۂ عشق

○

ہیں تری زلفِ رسا کے عاشق ہم بھی ہیں یار بلا کے عاشق
ان جفاؤں پہ وہی ذوقِ وفا ہم تو ہیں اپنی وفا کے عاشق

ک

○

لاغر ہوں اس قدر مجھے پہچانتی نہیں
رہ رہ کے دیکھتی ہے قضا سر سے پاؤں تک

اچھی کسی کی آنکھ کسی کی نگاہ ہے
یکتا ہیں آپ نام خدا سر سے پاؤں تک

○

کروں ضبطِ نفس ہمدم کہاں تک
لگی ہے آگ سی دل سے زباں تک

گ

○

اُس دلآرام کو ہے میرے دلِ زار سے لاگ
مژدہ اے مرگ مسیحا کو ہے بیمار سے لاگ

رو بھی لیں گھبرا کے دل تو بھی کچھ آنسو پچھ جائیں
ضبطِ غم تجھ کو ہے کیوں دیدۂ خونبار سے لاگ

مدد والے پیرِ مغاں المدد اے پیرِ مغاں
بڑھ گئی ہے بہت اب چرخِ ستم گار سے لاگ

تارے گِن گِن کے شبِ ہجر بسر کرتا ہوں
کیا کروں خواب کو ہے دیدۂ خونبار سے لاگ

بندۂ عشق ہوں میں ایک سے دونوں ہیں مجھے
کچھ نہ کافر سے محبت ہے نہ دیندار سے لاگ

بے طرح حال تمھارا تو میں پاتا ہوں امیرؔ
ہو گئی کیا کسی معشوقِ طرحدار سے لاگ

○

باغ میں آ کر وہ گلِ تازہ دکھلاتا ہے رنگ
گُل یہ شرماتے ہیں اک آتا ہے اک جاتا ہے رنگ

———

ل

○

انھیں دینا ہے اک چلبلا دل — یہ سنتا تھا کہ بجلی بن گیا دل

اُسے دیکھا تصدق کر دیا دل — کسی کو کیا مری آنکھیں مرا دل

وہاں ہی بادشاہ حسن کی ہے — ادائیں چھینے لیتی ہیں مرا دل

تڑپ جاتا ہوں میں اٹھتا ہے جب یہ — الٰہی درد ہے پہلو میں یا دل

تمہارا ہو نہ ہو اس کی خبر کیا — ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا دل

الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں — وہاں تو مانگتی ہے ہر ادا دل

تمہیں افسردہ پایا جب یہ آئی — تمہیں پایا شگفتہ کھل گیا دل

ادیب انداز سے نظارے دیکھا
نکلا ہی ہوا انھیں وہ لے لیا دل

○

بڑی بندہ نوازی کی جو دی یہ آبروئے قاتل
نہ تھا میرا گلا تیرے دمِ شمشیر کے قابل

جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اس سے جا کے کہہ دینا
ہمارا حال اے قاصد نہیں تحریر کے قابل

امیر اپنا دلِ پُر داغ سوئے کربلا لے چل
یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل

○

سنتا نہیں وہ دل سے کبھی داستانِ دل
کس سے بیاں کرے کوئی رازِ نہانِ دل

بے شبہ اس زمیں سے جدا ہے زمینِ عشق
اس آسماں سے ہے الگ آسمانِ دل

تو ہے وہ ماہِ مصر کہ جاتا ہے جس طرف
رہتا ہے ساتھ ساتھ ترے کاروانِ دل

رتبے میں وقتِ فکر سکندر سے کم نہیں
آتا ہوں سر جھکا کے میں یہ جہانِ دل

○

اے دل مجھے پیشِ بُہلا بات سے حاصل
خالی ہے مکاں حروف و حکایات سے حاصل
قسمت میں جو مُے ہے وہ بہر حال ملے گی
پھر قاضی و مفتی کی ملاقات سے حاصل

○

ہم ہیں پروانۂ دل سوختۂ بزمِ خیال
شمع رویوں سے یہاں گرم ہے شب بھر محفل

○

کی ہے جب غور سے ہم نے چمنِ علم کی سیر
خار معقول سے ہاتھ آئے ہیں منقول سے پھول

○

پھولوں سے بھرا ہوا ہے گلشن　　خالی ہے امیرؔ جائے بلبل

○

قفس میں آج بہت بے حواس ہے بلبل　　گلوں کی خیر ہو یا رب اُداس ہے بلبل

م

○

فرش سے عرش تک نشاں نہیں — دور پہنچے ہوائے یار میں ہم
حضرتِ دل جو تم ہو پہلو میں — مر کے بھی رہ چکے مزار میں ہم

○

مکانِ دل ہی ہے کس کا گزر نہیں معلوم — یہ بیخودی ہے کہ گھر کی خبر نہیں معلوم

○

کسی سے کوئی کچھ کرتا ہو باتیں — سنا کرتے ہیں تیری گفتگو ہم

○

مٹ نہ سکا تقدیر کا لکھا روز رہے پامالِ خطر ہم
صرصرِ غم سے دفترِ دل کے سارے ورق ہیں درہم برہم

○

ہے قصد شبِ غم میں کریں دل ہی سے باتیں
پھر کہتے ہیں دیوانے سے کیا بات کریں ہم

ن

○

کس کے چمکے چاند سے رخسار قیصر باغ میں
چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

سبزۂ خوابیدہ کیسا آ گیا جو خفتہ بخت
اس کے طالع ہو گئے بیدار قیصر باغ میں

فی الحقیقت یہ بھی کم گلزارِ جنت سے نہیں
حوریں پھرتی ہیں سرِ بازار قیصر باغ میں

ہر روش پر چل رہی ہے ایسی صحت کی ہوا
چشمِ نرگس تک نہیں بیمار قیصر باغ میں

بند جب ٹوٹیں شکستِ توبہ کی آئے صدا
لیں اگر انگڑائیاں میخوار قیصر باغ میں

ٹوٹتا پھرتا ہے یہ مارے خوشی کے صبح و شام
وجد میں ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

یہ اشارہ نہریں کرتی ہے سرِ انگشتِ موج
سب کا ہو جائیگا بیڑا پار قیصر باغ میں

تشنگانِ شوق ہیں شیریں لبوں کے میہماں
بٹ رہا ہے شربتِ دیدار قیصر باغ میں

قطرے شبنم کے رگِ گل پہ دکھاتے ہیں بہار
گندھ رہے ہیں موتیوں کے ہار قیصر باغ میں

کہہ رہی ہے یہ صنوبر قامتوں سے فاختہ
آؤ بھی بہرِ علم بردار قیصر باغ میں

نخلِ گل ہے ہر تماشائی رہے فیضِ بہار
پھول جھڑتے ہیں دمِ گفتار قیصر باغ میں

موجۂ مے کی نسیمِ صبح میں تاثیر ہے
بے صبوحی مست ہیں ہشیار قیصر باغ میں

اے دلِ مایوس بے برگی سے افسردہ نہ ہو — لائے گا نخلِ تمنا بار قیصر باغ میں
دور ہونگی کلفتیں مٹ جائینگی سب کاہشیں — لالہ ہے بے داغ، گل بے خار قیصر باغ میں

سایۂ بالِ ہما کیا ڈھونڈتا ہے اے امیر
بیٹھ زیرِ سایۂ دیوارِ قیصر باغ میں،

○

عدم کے جانے والے راستہ میں کب ٹھہرتے ہیں
جہاں یہ گھر سے نکلے جا کے منزل پر اُترتے ہیں

زمانہ ذرّہ و خورشید سے آئینہ خانہ ہے
مگر اس پر بھی جب دیکھا وہ پردے میں سنورتے ہیں

دلِ پُر آرزو کہتا ہے چل کر خضر سے پوچھو
سفینے قلزمِ امّید کے کس گھاٹ اُترتے ہیں

تفاوت اس قدر ہے زاہدوں میں اور رندوں میں
کہ وہ کچھ دل میں لے رہتے ہیں یہ سب کہہ گزرتے ہیں

خبر ہم سخت جانوں کی وہ سُن کر طنز سے بولے
کوئی مرنے کی حد ہے مر نہیں چکتے ہیں مرتے ہیں

ابھی اے جان تو نے مرنے والوں کو نہیں دیکھا
جئے ہم تو دکھا دیں گے کہ دیکھ اس طرح مرتے ہیں

عجب پردہ ہے پردہ شرمِ عصیاں کا دمِ آخر
اسی پردہ میں ساری عمر کے بگڑے سنورتے ہیں

مدد اے آبِ خنجر رحم کر ان تشنہ کاموں پر
نہ ان کی پیاس مرتی ہے نہ یہ پیاسے ہی مرتے ہیں
چلے ہی جاتے ہیں پیکِ نفس اک عمر گزری ہے
نہ منزل ہے کہیں ان کی نہ رستے میں ٹھہرتے ہیں
مغنی ہی کی میخانہ میں حاجت ہے نہ مطرب کی
شکستِ توبہ کی آواز پہ ہم وجد کرتے ہیں
وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بے ساختہ پن کی
سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں
قیامت دورِ تنہائی کا عالم روح پہ صدمہ
ہمارے دن لحد میں دیکھئے کیونکر گزرتے ہیں
خیال آتا ہے پیری میں جوانی خواب تھی گویا
پلک پیچھے جھپکتی ہے یہ دن پہلے گزرتے ہیں
کیا ہے نام کیا اُستاد کا روشن خدا رکھے
امیر استاد زادوں پہ ہم اپنے فخر کرتے ہیں

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برقِ تجلّی نے راہ میں

کیا دیر ہے امیرؔ کے عفوِ گناہ میں
اللہ کیا کمی ہے تری بارگاہ میں

اندھیر کر رہی ہے یہ چشمِ سیاہ میں
شوخی کو قید کیجیے نیچی نگاہ میں

دل ہے تباہ قافلہ اشک و آہ میں
گھیرا ہے آندھی پانی نے بیکس کو راہ میں

توبہ بھی کچھ بھروسہ کے قابل ہے زاہدو
پہنچی ہے ہم سے ٹوٹ کے اب خانقاہ میں

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں
کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں

افتادگی میں بھی مجھے معراج ہے نصیب
ٹھوکر بھی کھائی ہے تو محبت کی راہ میں

ہم رہروانِ عشق کو محشر کا خوف کیا
پڑتے ہیں ایسے کتنے ہی میدان راہ میں

تو نے تو اے سیاہیِ شب ہائے تارِ ہجر
دھبہ لگا دیا مرے بختِ سیاہ میں

وہ دیکھتے ہیں خونِ تمنا جما کے آنکھ
مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں

آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے
جس کے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں

قدرت خدا کی ہے کہ ملیں خاک میں تو ہم
اور سرمہ گھر کرے تری چشمِ سیاہ میں

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیرؔ
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

ہے نقش دل پہ صورتِ توحید اے امیرؔ
ہوں محوِ ذکر اشہد ان لا الٰہ میں

یہ عکس کس کے چاند سے چہرے کا پڑ گیا — پانی کو ناز ہے کہ میں یوسف ہوں چاہ میں

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیرؔ
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

○

کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں — دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ارباب کمال چل بسے سب — سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
فریاد کہ ناخدائے کشتی — کشتی کو مری ڈبو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں
زانو پہ امیرؔ سر کو رکھے — پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں
میں جاگ رہا ہوں اے شب غم — پر میرے نصیب سو رہے ہیں
آئینہ پہ بھی کڑی نگاہیں — کس پر یہ عتاب ہو رہے ہیں
اے حشر مدینہ میں نہ کر شور — چپ چپ سرکار سو رہے ہیں

○

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں — پھرتے تھے ہم بھی یونہی خوش خوش کبھی وطن میں

سمجھا یہ میں جو نکلے شاخوں سے گل چمن میں — صوفی نکل کے بیٹھے خلوت سے انجمن میں

آزاد ہو کے ہم نے ایامِ عمر کاٹے — دو چار دن سفر میں دو چار دن وطن میں

ہے چرخ پر یہ ایسا ابروئے ماہِ نو کا — کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکپن میں

کیا جانیے کہ چھوڑا پھولوں نے کیا شگوفہ — بلبل پکارتی ہے صیاد کو چمن میں

دیبا حریر قاقم تھا رختِ خواب جن کا — زیرِ لحد پڑے ہیں لپٹے ہوئے کفن میں

آوازِ کن جو آئی کانوں میں ہم یہ سمجھے — عبرت پکارتی ہے بس رہ چکے وطن میں

یاروں سے اُنس کیسا غربت میں عمر گزری — ٹھہرے مسافرانہ دو چار دن وطن میں

راتوں کو مثلِ شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے — ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں

چھیڑے صبا نہ اتنا کہہ دو میں بوئے گل ہوں — جا کر چمن سے مجھ کو آنا نہیں چمن میں

یارانِ رفتہ کا ہے غم اے امیرؔ ناحق
چھوٹے ہوئے سفر کے مل جائیں گے وطن میں

○

آزمائش میں جان لیتے ہیں — خوب آپ امتحان لیتے ہیں

دل بچے کس طرح حسینوں سے — مل کے سب چھپن چھپان لیتے ہیں

دل تو لیتے ہیں جان بوجھ کے پھر — بن کے انجان جان لیتے ہیں

تاک کر دل مرا کہا کہ امیرؔ — ہم تو ایسا جوان لیتے ہیں

میکشوں کو عروجِ مستی میں — ہاتھوں ہاتھ آسمان لیتے ہیں

ہر قدم پر برنگِ نقشِ قدم — دم ترے ناتوان لیتے ہیں

نہیں ساقی یہ قلقلِ مینا — ہچکیاں نیم جان لیتے ہیں

ہم سند کے لیے لغت میں امیرؔ
فصحا کی زبان لیتے ہیں

○

کسی کی روح پہ صدمہ ہو اشکبار ہوں میں
کسی کے دل میں اُٹھے درد بیقرار ہوں میں

کرم کہ تیرے کرم کا امیدوار ہوں میں
کسی کے دل میں اٹھے درد بیقرار ہوں میں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

کہو فلک سے ملائے نہ خاک میں مجھ کو
کہ انتخابِ جہان فخرِ روزگار ہوں میں

فسردگی ہے مری باعثِ خزانِ چمن
شگفتگی میں تماشائے نوبہار ہوں میں

امیرِ جاتی جوانی یہ مجھ سے کہتی ہے
خزاں نہ سمجھو مجھے آخری بہار ہوں میں

مرے گناہوں سے ہے تیری مغفرت کی نمود
گناہ گر نہ کروں تو گنہگار ہوں میں

زمینِ قصرِ سلاطیں سے آ رہی ہے صدا
کہ آج منزلِ عشرت ہوں کل مزار ہوں میں

کچھ آج میں نے نئی پی ہے حضرتِ واعظ
ازل کا مست پرانا شراب خوار ہوں میں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

بلائیں لیتی ہے پھر پھر کے گردِ نومیدی
یہ کس کے در پہ الٰہی امیدوار ہوں میں

بڑے مزے میں گزرتی ہے بے خودی میں امیرؔ
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

○

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں

وصل کیسا تیرے نادیدہ خریداروں میں ہوں
واہ ری قسمت کہ اس پر بھی گنہ گاروں میں ہوں

جان پر صدمہ جگر میں درد دل کا حال زار
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہگاروں میں ہوں

زاہد وہ کافی ہے اتنی بات بخشش کے لئے
اس کو شوقِ مغفرت ہے میں گنہگاروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

بیکنا ہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگاروں میں ہوں

○

جب کبھی ان کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں
دل ہی واقف ہے جس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

ہو کہیں لالہ و گل اور کہیں شمس و قمر
ہر جگہ تم کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں

ہر طرف اپنی ہی صورت ہمیں آتی ہے نظر
آئینہ خانے میں حیران سے ہم دیکھتے ہیں

دیکھتے تھے رخِ امید کو جس حسرت سے
یاس کو بھی اسی ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

جب نظر بندہ نوازی پہ تری جاتی ہے
مور کو بڑھ کے سلیمان سے ہم دیکھتے ہیں

بار بار آتی ہے زلف اس رخِ روشن کی طرف
ربط کافر کو مسلمان سے ہم دیکھتے ہیں

کُنہ باری کو پہنچ جائے دلا فکر سے تو
یہ تو باہر ترے امکان سے ہم دیکھتے ہیں

کچھ تمھیں سے نہیں کاوش ہے حسینوں کو امیر
چھیڑ پریوں کو ہر انسان سے ہم دیکھتے ہیں

○

تصور ایک بحرِ حسن کا یوں ہے مرے دل میں
روان رہتا ہے دریا جس طرح آغوشِ ساحل میں

ہزاروں قیس مشرب ساتھ پھرتے ہیں بیاباں میں
مرے دل میں خیالِ یار یا لیلیٰ ہے محمل میں

تڑپتا ہے دلِ صیاد بھی اس کے تڑپنے پر
قیامت کا اثر ہے اضطرابِ مرغِ بسمل میں

یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجنوں
نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلیٰ ہے محمل میں

یہ بیماری محبت کی کوئی نیرنگ ہے اے دل
جہاں آیا مسیحا درد دونا ہو گیا دل میں

لگا کر وار دیکھا پھر نہ دیکھا اس طرف تم نے
قضا روتی رہی بیٹھی ہوئی پہلوئے بسمل میں

امیرؔ اس کی تجلی گاہ ہے دنیا جو آنکھیں ہوں
وہی گل ہے گلستاں میں وہی ہے شمع محفل میں

○

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بُتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

یارانِ رفتہ سے کبھی جا ہی ملیں گے ہم
آخر تو پیچھے پیچھے اسی کارواں کے ہیں

گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل
آئی صدا ابھی تو مقام امتحاں کے ہیں

روشن چراغِ برق سے رہتا ہے رات دن
چمکے ہوئے نصیب مرے آشیاں کے ہیں

اے ہمتِ بلند ابھی تو کمی نہ کر
جلوے جو خاص ہیں وہ ادھر لامکاں کے ہیں

یاں جان پر بنی ہے تجھے ہیں رکاوٹیں
اے تیغ یار چل بھی یہ غمزے کہاں کے ہیں

وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کی زباں کے ہیں

○

رہی اے گل سبک رو جو کو تیری جستجو برسوں
پھرا کی کو بکو پیراہنِ یوسف کی بو برسوں

رہے تصویرِ حیرانی ہم ان کے رُو بہ رو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

کرے گا یاد اے غم ہم کو بعدِ مرگ تو برسوں
کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں

نہیں اے بیکسی بعدِ فنا کچھ خوفِ تنہائی
رہے گا میری تربت پر ہجومِ آرزو برسوں

فنا کے بعد ایسے بے کسوں کو کون پوچھے گا
مگر اے بیکسی رویا کرے گی ہم کو تو برسوں

امیر اک مصرعِ تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب ہوتا ہے شاعر کے لہو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں کی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

○

مرے مرقد کو ٹھکرانے قیامت بن کے آتے ہیں

پڑا ہوں میں یہاں آ کر تو یوں مجھ کو ستاتے ہیں

حسینانِ جہاں رکھتے ہیں شاید دزد کا شیوہ

جگہ دیتا ہے جو دل میں اُسی کا دل دکھاتے ہیں

وہ اٹھی پھر گھٹا وہ برق چمکی وہ بہار آئی

اٹھو رندو چلو واعظ تو یونہی سر پھراتے ہیں

ہماری لغزشوں کی تجھ کو اے زاہد خبر کیا ہے

فرشتے تھامتے ہیں ہاتھ جب ہم لڑکھڑاتے ہیں

گزرگاہِ جہاں خالی نہیں رہتی ہے کثرت سے

تماشا گاہ ہے دیکھو ہزاروں آتے جاتے ہیں

ہماری بے خودی تمہید ہے تیری نمائش کی

مٹا کر نقش ہم اپنا ترا نقشہ جماتے ہیں

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے

وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

○

دائرہ وہ چشمِ دل صفتِ نقشِ پا ہوں میں
ہر رہگزر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں

اے انقلابِ دہر مٹاتا ہے کیوں مجھے
نقشے ہزاروں مٹ گئے ہیں تب بنا ہوں میں

افتادگی میں اس سے نہ سمجھو جدا مجھے
سایہ صفت قدم بقدم زیرِ پا ہوں میں

مانندِ سبزہ اس چمنِ دہر میں امیر
بیگانہ وار ایک کنارے پڑا ہوں میں

○

تڑپا میں جو آنکھوں کو پسند آ گئیں آنکھیں
دل لوٹ گیا چوٹ غضب کھا گئیں آنکھیں

کیا مست نگاہیں مجھے دکھلا گئیں آنکھیں
دو جام تھے لبریز کہ چھلکا گئیں آنکھیں

اوروں سے تو بیباک سرِ بزم لڑیں
عاشق سے ہوئیں چار تو شرما گئیں آنکھیں

اس ناز سے دیکھا کہ بہم کٹ گئے عاشق
اک ایک کو اک ایک سے لڑوا گئیں آنکھیں

تاچند امیر اس چمنستاں کا نظارہ
دل سیر سے اکتا گیا پتھرا گئیں آنکھیں

○

اشک آنکھوں میں مرے گرمِ شتاب آتے ہیں
شہسوارانِ عدم پا بہ رکاب آتے ہیں

جو تہِ گنبدِ تسلیم و رضا بیٹھ رہے
غیب سے ان کے سوالوں کے جواب آتے ہیں

جوشِ وحشت مجھے ہر سال بناتا ہے جواں
جب بہار آتی ہے ایّامِ شباب آتے ہیں

دھیان بندھتا ہے جو اس عارض و گیسو کا امیرؔ
مستقل لخلخۂ مشک و گلاب آتے ہیں

○

ہٹاؤ آئینہ امیدوار ہم بھی ہیں — تمہارے دیکھنے والوں میں یار ہم بھی ہیں
تڑپ کے روح یہ کہتی ہے ہجرِ جاناں میں — کہ تیرے ساتھ دلِ بے قرار ہم بھی ہیں
کہو کہ نخلِ چمن ہم سے سرکشی نہ کریں — انھیں کی طرح سے باغ و بہار ہم بھی ہیں

ہمارے آگے ذرا ہو سنبھل کے زمزمہ سنج
کہ ایک نغمہ سرا اے ہزار ہم بھی ہیں

○

ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں
اب نہ باتوں میں مزہ ہے نہ ملاقاتوں میں

یہ سمجھ کر کبھی ناصح کی بھی سن لیتا ہوں
اک نہ اک بات نکل آتی ہے سو باتوں میں

چار ادھر لوٹتے ہیں چار اُدھر اے ساقی
مۓ کھنچی یا کوئی شمشیر خراباتوں میں

واعظ اب چھیڑ کے رندوں سے سنا کرتے ہیں
کچھ مزہ ملنے لگا ہے انھیں صلواتوں میں

بُت نہ بولیں جو نہیں بولتے ہیں ہم سے امیرؔ
اپنے اللہ سے باتیں ہیں مناجاتوں میں

○

وہ تو سنتا ہی نہیں ہے داد خواہی کیا کروں
کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں الٰہی کیا کروں

کل گیا تھا پیشِ زاہد سوچتا ہوں دل میں آج
خدمتِ پیرِ مغاں میں عذر خواہی کیا کروں

مجھ گدا کو دے نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس
چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں

دھوتے دھوتے آنسوؤں سے ہو گئیں آنکھیں سفید
بخت بد جاتی نہیں تیری سیاہی کیا کروں

وہ مرے اعمال روز شب سے واقف ہے امیرؔ
پیشِ خالق ادعائے بے گناہی کیا کروں

○

کیا سخی ہیں عدم آباد کے جانے والے　　نقدِ جاں پہلی ہی منزل پہ لٹانے والے

جو ترے دل میں ہے وہ دیکھنے والے تیرے　　نگہِ ناز کے انداز سے پا جاتے ہیں

گل سے مطلب نہیں گلشن میں نہ بلبل سے غرض　　سیر کرنے کو کبھی باغ میں آ جاتے ہیں

گو نکل جاتے ہیں آ آ کے گھٹا کے ٹکڑے　　ساقیا دل تو یہ مستوں کے بڑھا جاتے ہیں

سادہ آئینہ رخوں کو نہ سمجھنا اے دل
کہئے مطلب کی تو یہ صاف اڑا جاتے ہیں

○

حرم و دیر ہیں عشاق کے مشتاق مگر　　تیرے کوچے سے ادھر اور نہ ادھر جاتے ہیں

کوچۂ یار میں اوّل تو گزر مشکل ہے　　جو گزرتے ہیں زمانے سے گزر جاتے ہیں

شمع ساں جلتے ہیں جو بزمِ محبت میں تری　　نام روشن وہی آفاق میں کر جاتے ہیں

اثرِ آبِ بقا خاکِ رہِ عشق میں ہے　　وہی زندہ ہیں یہاں آ کے جو مر جاتے ہیں

زاہدو تم کو جناں ہم کو درِ یار پسند
خیر تم جاؤ اُدھر، ہم تو اِدھر جاتے ہیں

○

چلے ساقی ہنسے بولے اگر آئی ہے یاروں میں
دلہن بن کر نہ بیٹھے دخترِ رز بادہ خواروں میں
بہار آئی گھٹا چھائی کھلے بوتل چلے ساغر
نہ تم پرہیزگاروں میں نہ ہم پرہیزگاروں میں
جگر روتا ہے دل کو دل جگر کو طرفہ ماتم ہے
وہ اس کے سوگواروں میں یہ اس کے سوگواروں میں
امیر ان سے نہ بچتی دخترِ رز آنکھوں ہی پی جاتے
جوانی کا گزر شاید نہیں پرہیزگاروں میں

○

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ ہوں — صبحِ بہار ہو جو گریباں دریدہ ہوں
اے اہلِ بزم مجھ کو اٹھاؤ نہ بزم سے — شمعِ سحر ہوں عمر بپایاں رسیدہ ہوں
اب تک کسی پہ میری حقیقت کھلی نہیں — حرفِ نگفتہ ہوں سخنِ ناشنیدہ ہوں
مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے — دونوں سے مثلِ سرو میں دامن کشیدہ ہوں
شبنم کے اے امیر ملے ہیں مجھے نصیب
گل ہنس پڑیں چمن میں جو میں آبدیدہ ہوں

○

اس بت کے جور خالق اکبر سے کیا کہیں
آپس کی چھیڑ واور محتسب سے کیا کہیں

ملتا نہیں مکاں سے پتہ لامکان تک
ہم کیا ہوئے نکالتے گھر سے کیا کہیں

ٹھیرا ہے روز حشر پہ دیدار یار کا
اللہ حشر تک دل مضطر سے کیا کہیں

○

رہے ہیں وصل میں کیا کیا نیاز و ناز کے جھگڑے
کبھی ہم روٹھ کے اُٹھے کبھی وہ من کے بیٹھے ہیں

بگڑ کر جب وہ اُٹھے ہیں تو دل بیٹھے ہیں لاکھوں کے
ہزاروں فتنے اُٹھے ہیں جہاں وہ من کے بیٹھے ہیں

بڑے ہی قدرداں کانٹے ہیں صحرائے محبت کے
کہیں گاہک گریباں کے کہیں دامن کے بیٹھے ہیں

بہت آتی ہے مجھ کو شرم اس محفل میں کچھ پڑھتے
کہ میں ناقص ہوں اور کامل یہاں ہر فن کے بیٹھے ہیں

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

○

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں
یہ سب گیند ان کے اچھالے ہوئے ہیں

عجب بے خودی صحبتِ وصل میں ہے
وہ ہم کو ہم ان کو سنبھالے ہوئے ہیں

لپیٹے ہیں چوٹی میں ہار اس پری نے
جو کالے تھے اب کوڑیالے ہوئے ہیں

امیر ایسے روتے ہیں ہم میکدے میں
لہو سے لبالب پیالے ہوئے ہیں

○

گم گشتہ دل کی تا بکجا جستجو کریں
ہاں اور دل ملے تو تری آرزو کریں

یارب وہ ذوق دے کہ ترے مستِ معرفت
مستی بغیر بادہ و جام و سبو کریں

کب زاہدوں کو مشربِ عشق کا ہے فہم
نامحرموں سے راز کی کیا گفتگو کریں

ہے غنچہ ساں بہار خموشی میں اے امیر
بلبل کی طرح باغ میں کیا ہاؤ ہو کریں

○

طولِ شبِ فراق کا قصہ نہ پوچھیے — محشر تلک کہوں میں اگر مختصر کہوں
سنتے ہیں آپ سارے زمانے کا دردِ دل — کہیے تو میں بھی قصۂ سوزِ جگر کہوں

ہرگز نہ فرق آئے مری بات میں امیرؔ
اک بار جو کہا ہے وہی عمر بھر کہوں

○

جب خوبرو چھپاتے ہیں عارض نقاب میں
کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا حجاب میں

رکھا یہ تم نے پائے حنائی رکاب میں
یا پھول بھر دیے طبقِ آفتاب میں

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ملنے کا وعدہ منہ سے تو ان کے نکل گیا
پوچھی جگہ جو میں نے کہا ہنس کے خواب میں

○

جذبِ دل ان سے یہ کہتا ہے کہ اب کیوں آئے
تم تو کہتے تھے کہ آنا مرا ممکن ہی نہیں

یوں تو سلجھے گا نہ الجھا ہوا بوسوں کا حساب
سہل سا گر ہیں بتا دوں تجھے تو گن ہی نہیں

اے صنم وصل میں کیا قید کہ ٹھہرے کس دن
سب دن اللہ کے ہیں کوئی برا دن ہی نہیں

○

عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں پھر چھوٹ جاتے ہیں
جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی
مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

○

کہتا ہے کون آہ میں اپنی اثر نہیں
ہاں دل دکھے کسی کا یہ مدِ نظر نہیں

ہم بے قرار لوٹتے ہیں کب سے خاک پر
آسودگانِ خاک تمہیں کچھ خبر نہیں

دنیا ہے طرفہ میکدۂ بیخودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

○

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی سے جھولوں میں
وہ گلعذار کہ تُلتے تھے روز پھولوں میں۔
اُنہیں کی خاک نہ پائے آج ہے بگولوں میں
محمدؐ عربی سا کہاں ہے کوئی امیر
خدا کے فضل سے سرتاج ہیں رسولوں میں

○

اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں
نار کرنے سے مجھے منع نہیں کرتا میں
پر نہ اتنے کہ اٹھاؤں تو اٹھا بھی نہ سکوں
کوئی پوچھے تو محبت سے یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دیں میں بھلا بھی نہ سکیں

گلے میں ہاتھ تھے شب اس پری سے راہیں تھیں
سحر ہوئی تو وہ آنکھیں نہ وہ نگاہیں تھیں

مشاعرے سے حسیں کیوں نہ چھین لے جاتے
رباعیاں مری چو گوشیہ کلاہیں تھیں

فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ
جہاں بنے ہیں یہ میخانے خانقاہیں تھیں

مرتبہ تیغِ ادا کا وہی بسمل سمجھیں
زیست کو مرگ مسیحا کو جو قاتل سمجھیں

قاتلوں سے کہو سر کاٹ کے مغرور نہ ہوں
اپنے سر کو بھی تہِ خنجرِ قاتل سمجھیں

اے پری ان کے لئے فکرِ سلاسل ہے عبث
جو تری زلفِ مسلسل کو سلاسل سمجھیں

اے امیر اول تو وہ نا آشنا ملتا نہیں
مل گیا جس کو تو پھر اس کا پتا ملتا نہیں

ذبح کرتا ہے تو میرے دست و بازو کھول دے
رحم کر قاتل کہ بے تڑپے مزا ملتا نہیں

راہرو کا ذکر کیا ہے سرزمینِ عشق میں
سیکڑوں منزل نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

○

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سُو بدلتے ہیں
جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں
تری نیچی نگاہیں سایۂ مژگاں ہیں پڑتی ہیں
پرے میں جیسے بانکے پینترے ہر سُو بدلتے ہیں
امیرؔ اس باغ میں رہ کر کریں کیا دم الجھتا ہے
نہ نخوت چھوڑتے ہیں گل نہ کانٹے خو بدلتے ہیں

○

گرچہ دیکھے خواب اچھے سب نے تعبیریں کہیں
وصل کی بنتی ہیں اِن باتوں سے تدبیریں کہیں
لاکھ محنت کی نہ نکلی وصل کی صورت امیرؔ
سامنے تقدیر کے چلتی ہیں تدبیریں کہیں

○

مئے پئیں کیسا کہ کچھ فضا ہی نہیں — ساقیا باغ میں گھٹا ہی نہیں
کل تلک تھا وہ ربط نہ وہ اخلاص — آج وہ شوخ آشنا ہی نہیں

○

بزم میخانہ ہے کیا انجمن ناز و نیاز
ہاتھ کس مست کے یاں شیشہ کی گردن میں نہیں

کیا زمانہ ہے نہیں صاف کسی سے کوئی
دوست کے دل میں وہ ہے جو دلِ دشمن میں نہیں

○

ہم جو مست شراب ہوتے ہیں   ذرّے سے آفتاب ہوتے ہیں
وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر   شعر جو انتخاب ہوتے ہیں

○

دامن رحمت اگر آیا ہمارے ہاتھ میں،
پھول ہو جائیں گے دوزخ کے شرارے ہاتھ میں

○

یہ چرچے یہ صحبت یہ عالم کہاں   خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں
جو خورشید ہو تم تو شبنم ہیں ہم   ہوئے جلوہ گر تم تو پھر ہم کہاں

○

○

دل ٹھہر جائے یہ امید نہیں   ایسے بگڑے کہیں سنورتے ہیں

○

خنجر بکف جو اپنے قاتل کو دیکھتے ہیں
دل ہم کو دیکھتا ہے ہم دل کو دیکھتے ہیں
آنکھوں کو بند کر لیں خالق سے لو لگائیں
کیوں غرق ہونے والے ساحل کو دیکھتے ہیں

○

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں   چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں
مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے   آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

○

الجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں
وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں
امیر وصل میں اس شوخ نے تلوّن سے
ہزار بار کہی ہاں ہزار بار نہیں

○

مانگنا ہو جو مانگ لے اس سے کونسی شے خدا کے گھر میں نہیں

○

دل جدا مال جدا جاں جدا لیتے ہیں اپنے سب کام بگڑ کر وہ بنا لیتے ہیں

○

ہاں ہم ہی ہم تھے کوئی نہ تھا ان کی بزم میں
یا اک جہاں آج وہاں ہے ہمیں نہیں

○

داغ اے بہار جیسے ہمارے بدن میں ہیں
اس رنگ و بو کے پھول بھی تیرے چمن میں ہیں
نالہ ذرا کرے تو سمجھ بوجھ کر کرے
بلبل سے کوئی کہہ دے کہ ہم بھی چمن میں ہیں

○

قابلِ عفو ہیں آلودۂ عصیاں ہو لوں اے اجل صبر کر اتنا کہ پشیماں ہو لوں
قدرِ راحت کی بس رنج ہے دنیا میں امیرؔ تب چلوں باغ میں جب قیدیِ زنداں ہو لوں

○

نازانداز ادا غمزہ کرشمہ شوخی
لے کے آیا ہے پرنخانہ پری رو دل ہیں
حکم ہے ضبط محبت کا کہ ہو راز نہ فاش
آ کے آنکھوں ہیں پلٹ جاتے ہیں آنسو دل ہیں

○

تیرے وعدہ پہ شاد ہوں کیوں کر — اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں
ہوئے زاہد مرید پیرِ مغاں — واہ مرشد کو مانتا ہوں میں

○

ہر چند نہیں وصال ممکن — وہ چاہے تو ہے محال ممکن
امید جواب کی ہو کیا خاک — جب اس سے نہ ہو سوال ممکن

○

راحت کو ڈھونڈھتا ہے عبث تو جہان ہیں — اس کا زمیں پہ ہے نہ پتہ آسمان ہیں
دینی نہ تھی کسی کو جو اے آفریدگار — پیدا ہی کیوں کیا تھا خوشی کو جہان میں

○

اشک سے جب دیکھئے معمور ہیں دونوں آنکھیں ہیں کہ دو ناسور ہیں

○

کوئی مجھ کو لیے جاتا ہے کہیں نہیں معلوم کہاں جاتا ہوں

○

راہ صحرا کی جو ہم لیتے ہیں جتنے کانٹے ہیں قدم لیتے ہیں

○

ہم کو فردائے حشر کا کیا غم کہ شبِ ہجر کی سحر ہی نہیں

○

کرتے ہیں جو لوگ ذکر ان کا ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہوں

○

رات دن غم پہ غم گزرتے ہیں ہم تو اس زندگی پہ مرتے ہیں

○

صیّاد سے چھری کے تلے عندلیب نے
حسرت سے یہ کہا کہ غریب الوطن ہوں میں

○

بے تکلف ہو تو ہم شعر و سخن پر غش ہیں
کوئی معشوق ہو بے ساختہ پن پر غش ہیں

○

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
رہ گئی ایک نہیں ہاں کا کہیں نام نہیں

○

دیکھنے کو تمہیں اے اہلِ عدم آتے ہیں
خیر اگر تم نہیں آتے ہو تو ہم آتے ہیں

○

کھا کے تلوار جو قاتل کی فغاں کرتا ہوں
لذّتِ زخم رقیبوں سے نہاں کرتا ہوں

○

دل سے کہتا ہے تصور یار کا
تو مصور ہے تو میں تصویر ہوں

○

میں جانتا ہوں بلبل جو ہے تری حقیقت
اک مشت استخواں ہیں دو پر لگے ہوئے ہیں

○

میں الفت کے وہ حسن کے جوش میں
نہ میں ہوش میں ہوں نہ وہ ہوش میں

○

وہ انتظار کسی کا کرے جو آپ میں ہو ہم ایک عمر سے اپنی ہی راہ دیکھتے ہیں

○

کلیاں یہ سرخ سرخ نہیں لالہ زار میں مہندی لگی ہے دستِ عروسِ بہار میں

○

کیونکر بیاں کروں جو مزہ خامشی میں ہے کہنے کی ہو نہ بات تو میں اس کو کیا کہوں

○

بیخودی میں بھی مری رنگ ہے نیرنگی کا کبھی صہبا کبھی مینا کبھی ساغر میں ہوں

○

وہ گالی دیتے ہیں شکوہ کروں تو کہتے ہیں
کسی کا ذکر نہیں ہے کسی کا نام نہیں

○

جامہ زیب وہ نمائش بعد مردن کیا ہوئی
پیرہن میں تھی جو سج دھج وہ کفن میں کیوں نہیں

○

بخت ایسے کہاں ہیں جو کروں یار سے باتیں　　کرتا ہوں میں شب بھر در و دیوار سے باتیں

○

شوخی بھی قیامت تری مستانہ ادائیں
فتنوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں

○

روٹھنا روز کا جھگڑا ہے تو یہ سن رکھیے
روز کے روٹھنے والے کو مناتے بھی نہیں

○

ہمیں لے گئی بیخودی دور امیرؔ　　خدا ہی ملائے تو اب ہم ملیں

○

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہم کو امیرؔ　　کسی کی آنکھ بھی جب ہم پر آپ دیکھتے ہیں

○

یار کے اُٹھتے ہی برہم ہو گیا سامانِ عیش
مے کہیں مینا کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں

○

پھولوں سے کہہ صبا یہ خوشی کی جگہ نہیں
رونے کا ہے مقام ہنسی کی جگہ نہیں

○

صورت کو اس کی دیکھ کے سمجھے ہو تم غریب
تم سے کبھی امیر سے باتیں نہیں ہوئیں

○

ڈراؤں حشر کی فریاد سے تو کہتے ہیں
ہمارے آگے تمھاری وہاں سنے گا کون

○

گھات میں محتسب کو رہنے دو
مست بھی ہوشیار رہتے ہیں

و

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

لے گئی کل ہوسِ مے جو سرِ خم مجھ کو
ہوش کی طرح سے مستی نے کیا گم مجھ کو

واہ رے بیخودیِ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو

لالہ و گل ہوں خس و خار ہوں یارب کیا ہوں
ڈوبتا ہوں تو ڈبوتا نہیں قلزم مجھ کو

تجھ کو قاتل ہی کے لعلِ لبِ خنداں کی قسم
نیم جاں چھوڑ نہ اے تیغِ تبسم مجھ کو

میں تو کیا عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

دھوکا کھائے ہوئے آدم کو زمانہ گزرا
ہنستے ہیں دیکھ کے اب تک لبِ گندم مجھ کو

میں ترا عکس تھا اس آئینۂ ہستی میں
تو نے کیا پھیر لیا منہ کہ کیا گم مجھ کو

اور تھا کون شبِ ہجر مصیبت کا شریک
دیکھتا تھا جو میں انجم کو تو انجم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

○

اے خوشا وحدت نما کثرت کشا نیرنگِ عشق
دیکھتا ہوں ہر مرقع میں تری تصویر کو

اپنے بسمل کا ذرا شوقِ شہادت دیکھئے
دے رہا ہے کیا گلے مِل مِل کے دم شمشیر کو

ڈال دی عشّاق کی آنکھوں پہ حیرت کی نقاب
واہ کس پردے میں رکھا حسن کی تصویر کو

ناز کیونکر ہو گنہ ہوں پر نہ مجھ کو اے کریم
پیار کرتی ہے تری رحمت مری تقصیر کو

سبزۂ رخسارِ جاناں پر لکھا کیا خوب خط
چوم لوں پاؤں جو دستِ کاتبِ تقدیر کو

پوچھتی ہے شمع پروانوں سے تیری داستاں
گل سنا کرتے ہیں بلبل سے تری تقریر کو

○

گھر گھر تجلیاں ہیں طلبگار بھی تو ہو — موسیٰ سا کوئی طالبِ دیدار بھی تو ہو

دلِ دردناک چاہیئے لاکھوں ہیں خوب رُو — عیسیٰ ہیں سیکڑوں کوئی بیمار بھی تو ہو

گر ہم نہیں تو رونقِ بازارِ عشق کیا — اے حسن خود فروش خریدار بھی تو ہو

پردے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بپا — اے آفتابِ حشر نمودار بھی تو ہو

اتنی اُداس صحبتِ مے واہ مے کشو — دستِ سبو میں شیخ کی دستار بھی تو ہو

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے!
پہلے شرابِ پی کے گنہگار بھی تو ہو

○

چھوڑو نہیں اے بتو حیا کو — کیا منہ نہ دکھاؤ گے خدا کو

ظالم تجھے دل دیا خطا کی — بس بس میں پہنچ گیا سزا کو

کانٹوں سے کہو سنبھال لینا — غش آتا ہے اک برہنہ پا کو

اے حضرتِ دل بتوں کو سجدہ — اتنا تو نہ بھولیئے خدا کو

گل کر گئی میری شمعِ تربت — کیا موج سی آ گئی صبا کو

کہتی ہے امیر اس سے شوخی — اب منہ نہ دکھائیے حیا کو

○

تڑپنا چاہتا ہوں لذّتِ ناوک سے اے قاتل
نہ میں سوفار ہی کو دیکھتا ہوں اور نہ پیکاں کو

تصوّر قید میں ہے اے امیرؔ اک بُت کی آنکھوں کا
پری خانہ بنا رکھا ہے میں نے اپنے زنداں کو

میں اک غربت زدہ باقی رہا تھا میں بھی آتا ہوں
مبارکباد دے آئے کوئی گورِ غریباں کو

بہت ہے زور پر دستِ جنوں ناصح الگ رہنا
ترا دامن نہ پکڑے چھوڑ کر میرے گریباں کو

ہوائے گل اسے کہتے ہیں اے بلبل کہ جنگل میں
لئے پھرتا ہے ہر طاؤس ساتھ اپنے گلستاں کو

امیرؔ ایسی کہاں قسمت کہ پہنچوں اُڑ کے پھولوں تک
کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

○

راز توحید کا جو ظاہر ہو — ایک منظور اور ناظر ہو
کوسِ رحلت سے آتی ہے آواز — کہ خبردار اے مسافر ہو
شبِ فرقت دراز ہے دیکھیں — عمر آخر ہو یا یہ آخر ہو
اتنی وابستگی جہاں سے کیا — شہر بیگانہ تم مسافر ہو

اوّل عشق میں یہ حال امیرؔ
تم تو آغاز ہی میں آخر ہو

○

چین آتا نہیں دم بھر کسی پہلو مجھ کو
اتنی تکلیف تو اے درد نہ دے تو مجھ کو

میں جہاں بیٹھ کے روتا ہوں ہنسی ہوتی ہے
ہر جگہ کرتے ہیں رسوا مرے آنسو مجھ کو

بار بار اس گلِ خوبی کا سمٹنا شبِ وصل
یاد دلواتے ہیں شرما کے لجالو مجھ کو

○

لو ہم تو آگے جاتے ہیں صحرائے عشق میں
یارو تم اپنے پاؤں سے کانٹے چُنا کرو

شوخی یہ ہے کہ دے کے وہ عاشق کو گالیاں
کہتے ہیں شاہ جی مرے حق میں دعا کرو

جب پوچھتا ہوں ان سے دوا دردِ عشق کی
کہتے ہیں پہلے ہوش کی اپنے دوا کرو

کیا قدر ہے فسانۂ الفت کی واں امیرؔ
کہتے ہیں ہم سُنیں نہ سُنیں تم کہا کرو

○

حسن کس کام کا جو آن نہ ہو — کیا وہ معشوق جس میں شان نہ ہو
لے جنوں لے چل اب وہاں کہ جہاں — یہ زمیں اور یہ آسمان نہ ہو
یوں مٹا الفتِ خدا میں خودی — نام باقی رہے نشان نہ ہو

ہم رہیں تم رہو وصال رہے
غم نہیں ہے جو یہ جہان نہ ہو

○

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو
جھنجھلا کے نہ دیں وہ مجھے ہنس کے ایسی کوئی اے دل جو خطا ہو تو مزا ہو

کیا شوق تھا مر قد سے قیامت میں بھی پہنچا
کہتا ہوا اب وعدۂ دیدار وفا ہو

○

میں نے تعریف حسن کی تو کہا کیوں مجھے شرمسار کرتے ہو
بن کے انجان مجھ سے کہتے ہیں سچ کہو کس کو پیار کرتے ہو

سچ کہو کس کو دل دیا ہے امیر
جان کس پر نثار کرتے ہو

○

وصل کی رات تو راحت سے بسر ہونے دو شام ہی سے ہے یہ دھمکی کہ سحر ہونے دو
جس نے یہ درد دیا ہے وہ دوا بھی دے گا لا دوا ہے جو مرا درد تو بڑا ہونے دو

ہوں غریب اور غریبوں کا خدا والی ہے
ہونے دو سارے زمانے کو اندھیر ہونے دو

وہ حسن کیا ہے حسن جو خاطر نشیں نہ ہو
کس کام کا وہ نام جو زیبِ نگیں نہ ہو

ہستی جہاں کی ہستیِ حق پر دلیل ہے
کیونکر جہاں ہو جو جہاں آفریں نہ ہو

سر آستانِ دل پہ نہ پہنچے کبھی امیرؔ
جب تک کہ عرش پر قدمِ اوّلیں نہ ہو

آج محفل سے تم آئے ہو اُٹھانے ہم کو
ہائے وہ دن کہ جو اُٹھتے تھے بٹھانے ہم کو

دیر میں شیخِ حرم سے یہ صنم کہتے ہیں
تو نے اللہ کو جانا ہو تو جانے ہم کو

سات عالم میں یہ شہرت ہے قضا نے مارا
واہ کس پردے میں مارا ہے ادا نے ہم کو

پہلے تو مجھے کہا نکالو
پھر بولے غریب ہے بلا لو

گھبرا کے ہم آئے تھے سوئے حشر
یاں پیش ہے اور ماجرا لو

اوروں پہ امیرؔ تکیہ کب تک
تم بھی تو کچھ آپ کو سنبھالو

○

پہلے تم اپنی جنون اپنی نظر کو دیکھو — پھر جس نے دل دیا ہے اس کے جگر کو دیکھو
حالت مریضِ غم کی کچھ تم ہی جانتے ہو — ایک ایک غش کو دیکھو دو دو پہر کو دیکھو

○

وصال پر جو ہے وصل امتحان کر دیکھو — امیر یوں ہی سہی جیتے جی روز مر دیکھو
امیر جلوۂ وحدت سے آشنا ہو جو دل — وہی ظہور وہی شان ہے جدھر دیکھو

○

نوجوان کوئی جو ہری میں نظر آتا ہے — یاد آتی ہے بہت اپنی جوانی مجھ کو
نغمہ سنجانِ گلستانِ سخن ہیں جو امیر — کہتے ہیں بلبلِ گلزارِ معانی مجھ کو

○

ہوں ہیں وہ میکش اٹھا ساقی مری تعظیم کو
گردنِ مینائے مے خم ہو گئی تسلیم کو

○

انساں عزیزِ خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہو — وہ مہرباں نہ ہو تو کوئی مہرباں نہ ہو
جانے اگر کہ چاہِ عدم میں گرائے گا — کوئی سوار توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

○

پر جو کھولے بھی تو کب کھولے خزاں جب آگئی
رحم آیا بھی تو کب آیا مرے صیاد کو
مجھ سا صیدِ خفتہ طالع کون ہوگا عندلیب
نغمہ سنجی سے مری نیند آگئی صیاد کو

○

کیا بے خبری ہے کہ خبر یار کی مجھ تک
آتی بھی ہے تو آپ میں باقی نہیں مجھ کو
ہے خواب میں آنے کا امیرؔ اس سے جو وعدہ
سوت ایک طرف نیند بھی آتی نہیں مجھ کو

○

اے ضبط دیکھ عشق کی ان کو خبر نہ ہو
دل میں ہزار درد اُٹھے آنکھ تر نہ ہو
مدّت میں شام وصل ہوئی ہے مجھے نصیب
دو چار سو برس تو الٰہی سحر نہ ہو

○

اے تیغِ یار دل کے گلے سے جدا نہ ہو
اب روٹھنے کا وقت نہیں ہے خفا نہ ہو
حسرت سے دیکھتا ہوں جو ان کی طرف امیرؔ
کہتے ہیں دیکھو دیکھو کوئی دیکھتا نہ ہو

○

نہ آؤ تم تو مزاجِ چمن بحال نہ ہو
شجر نہال نہ ہو گُل کا چہرہ لال نہ ہو
یہ چاہتا ہے تحیّر کہ دونوں ہوں تصویر
اُدھر جواب نہ ہو کچھ اِدھر سوال نہ ہو

○

ہوں میں بیکس کوئی ہمدم ہے نہ غمخوار مرا
درد ہی اُٹھ کے سنبھالے تو سنبھالے دل کو
کہتے ہیں شوق سے آئیں مری محفل میں امیرؔ
ساتھ لائیں نہ مگر لوٹنے والے دل کو

○

میکشو الجھو نہ واعظ سے عبث جانے بھی دو
منہ کی کھائے گا اگر آتا ہے منہ آنے بھی دو
حضرتِ دل اب تو چندے ربط پریوں سے رہے
حوریں جنّت میں جو گھبراتی ہیں گھبرانے بھی دو

○

تُو ہو تو بتکدہ بھی مجھے کعبہ سے کم نہیں
کعبہ صنم کدہ ہے جو کعبہ میں تو نہ ہو
ہیں ان کو دیکھتے ہی جو گُل لوٹنے لگا
بولے تمھارے مارے کوئی تندرو نہ ہو

○

پھر کر گردن بسمل پہ جو رک جاتے ہیں
ذبح کرنے کا سکھاتے ہیں چلن خنجر کو

○

اس ادا سے کیا شہید اس نے　　　خوں بہا مل گیا شہید دل کو

○

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جلدی کیا ہے دم لے لو
نہ چھیڑوں گا میں جیسی چاہو تم مجھ سے قسم لے لو

○

فکر کس بات کی ہے تم کو [illegible] کیا سبب ہے کہ سر بہ زانو ہو

○

غافل مری طرف سے ایسے جو ہو رہے ہو
آنکھیں تو کھولو صاحب کس نیند سو رہے ہو

○

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو
تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

○

نہیں گھیرا ہے پلکوں نے یہ چشمِ مست دلبر کو
لیا ہے دونوں ہاتھوں سے کسی میکش نے ساغر کو

O

منکرِ گوشہ نشینانِ خرابات نہ ہو
کہ یہی گوشہ کہیں قبلۂ حاجات نہ ہو

O

بھرے آتے ہیں آنسو میرا حالِ زار دیکھو تو
اٹھا ہے آج کیسا ابر دریا بار دیکھو تو

ہمہمہ

○

دل جو سینے میں زار سا ہے کچھ — غم سے بے اختیار سا ہے کچھ
رخت ہستی بدن پہ ٹھیک نہیں — جامۂ مستعار سا ہے کچھ
چشم نرگس کہاں وہ چشم کہاں — نشہ کیسا خمار سا ہے کچھ
نخلِ امید میں نہ پھول نہ پھل — شجر بے بہار سا ہے کچھ
ساقیا ہجر میں یہ ابر نہیں — آسماں پر غبار سا ہے کچھ
کل تو آفت تھی دل کی بے تابی — آج بھی بے قرار سا ہے کچھ
اُس کو دُنیا کی اِس کو خلد کی دُھن — رند ہے کچھ نہ پارسا ہے کچھ

پہلے اس سے تھا ہوشیار امیر
اب تو بے اختیار سا ہے کچھ

○

تیر پر تیر لگا دیکھ کے او صید افگن
لوٹ جائے نہ قضا بھی کہیں نخچیر کے ساتھ

کیا شبیہہ رُخ گلگوں نے دکھایا عالم
کھچ گیا رنگ میں نقّاش بھی تصویر کے ساتھ

عرصۂ جنگ میں بھی تیغ بجے اے ساقی
کیا مزہ ہو جو چلے جام بھی شمشیر کے ساتھ

بات سیدھی بھی ہوئی جاتی ہے اُلٹی جو امیرؔ
ضد ہے شاید مری تقدیر کو تدبیر کے ساتھ

کیا عجب میں بھی شہیدوں میں ہوں محسوب امیرؔ
اُنس رکھتا ہوں بہت حضرتِ شبّیر کے ساتھ

○

ساقیِ بزمِ روزِ ازل نے بادۂ حسن بھرا ہے اس میں
آنکھیں ہیں ساغر شیشہ ہے گردن ماشاء اللہ ماشاء اللہ

قہر غضب ظاہر کی رکاوٹ آفتِ جاں در پردہ لگاوٹ
چاہ کے تیور پیار کی چتون ماشاء اللہ ماشاء اللہ

واہ امیر ایسا ہو کہنا شعر ہیں یا معشوق کا گہنا
صاف ہے بندش مضموں روشن ماشاء اللہ ماشاء اللہ

○

چھوٹے جو اپنے ہاتھ سے اس دلربا کے ہاتھ
سارے جہاں سے بیٹھ رہے ہم اٹھا کے ہاتھ

قاضی کو شوق بادہ کشی کا ہے ان دنوں
بنت العنب پڑی ہے عجب پارسا کے ہاتھ

○

خزاں میں کہئے نہ بلبل سے چہچہانے کو
کہ وہ بہار کی باتیں گئیں بہار کے ساتھ

ی — ے

○

ذوقِ مے خوشی بڑھاتی ہے گھٹا برسات کی
اور لے اڑتی ہے مستوں کو ہوا برسات کی

اے پری اس فصل میں سرگرمِ آرائش نہ ہو
آگ تلووں میں لگاتی ہے حنا برسات کی

ابر، دریا، سبزہ، ساقی، یار، مطرب، دخترِ رز
ہو یہ سب ساماں تو پھر دیکھیں فضا برسات کی

شیرۂ انگور کو کرتی ہے آبِ آتشیں
آگ پانی میں لگاتی ہے ہوا برسات کی

رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نوعروسانِ چمن
پتے پتے سے ٹپکتی ہے ادا برسات کی

میکدہ میں بوتلوں کے منہ سے اڑ جاتے ہیں کاگ
ہوش مستوں کے اڑاتی ہے ادا برسات کی

مور ناچے کوئلیں کوکیں پپیہے بول اُٹھے
وصل کے دن آ گئے فصل آئی کیا برسات کی

ڈال کر جھولا چمن میں تم نے جب گائی ملہار
پینگ دینے کے لئے آئی ہوا برسات کی

کیا تری زلفِ سیہ کو دیکھ کر شرما گئی
بھیگی بھیگی رات ہے اے مہ لقا برسات کی

ٹکریں لیں ابر سے مستوں نے پی پی کر شراب
کیا بلا ہوتی ہے مستی ساقیا برسات کی

جب چمن میں آ گیا مستوں کو ساون کا خیال
ساونی گاتی ہوئی آئی گھٹا برسات کی

زاہدوں کی توبہ ٹوٹی لڑکھڑایا پائے شیخ
کچھ عجب مستانہ رُت ہے ساقیا برسات کی

میکشوں کے منہ سے جو اس فصل میں نکلی دعا
لے اُڑی بابِ اجابت کو ہوا برسات کی

دخترِ رز سے کہہ دے ساقی اور کچھ لے چار دن
فصل آ پہنچی ہے اونا آشنا برسات کی

ہر روش پر ہو چمن میں اک پری ساغر بکف
ایک دن یوں دیکھیں اے ساقی فضا برسات کی

پتّے پتّے پر ہے ساقی سبزۂ مینا کا رنگ
کیا نظر آتی ہے سبزی خوشنما برسات کی

نونہالانِ چمن میں تھا کہاں یہ حسن امیر
حضرتِ یوسف سے ہے ساری فضا برسات کی

○

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے

تند مئے اور ایسے کمسن کے لئے ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں بُرا ہم بُرے سب سے ہوئے جن کے لئے

کون ویرانے میں لوٹے گا بہار پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے

جھاڑنی ہے کونسے گل کی نظر بلبلیں پھرتی ہیں کیوں تنکے لئے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند اب کوئی حور آئے گی ان کے لئے

وصل کا دن اور اتنا مختصر دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر بھیجتے مسجد مؤذن کے لئے

لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

○

خودی سے بے خودی میں آ جو شوقِ مے پرستی ہے
جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل وہ ہستی ہے

سرِ راہِ عدم گورِ غریباں طرفہ بستی ہے
کہیں غربت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے

بہار آئی ہے ساقی عام فیضِ مے پرستی ہے
در و دیوار سے اس دور میں مستی برستی ہے

تری مسجد میں واعظ خاص ہیں اوقاتِ رحمت کے
ہمارے میکدہ میں رات دن رحمت برستی ہے

قدم جس خاک پر پڑتا ہے تیرے خاکساروں کا
اگر اکسیر کے مولوں وہ ہاتھ آئے تو سستی ہے

نہ گھبرا اے دلِ درماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

نہ شاخِ گُل ہی اُونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

بڑھ لے آہِ رسا اب کنگرے پہ عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

جوانی لے گئی ساتھ اپنے سارا عیش مستوں کا
صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ ساغر ہے نہ مستی ہے

نہ کوئی شمع لاتا ہے نہ کوئی گل چڑھاتا ہے
مزاروں پہ غریبوں کے عجب غربت برستی ہے

امیرؔ اک تختۂ ہموار ہے یہ شعر کا کوچہ
طبائع کے تفاوت سے بلندی اور پستی ہے

○

مئے دخترِ رز پہ جواں کیسے کیسے ۔۔۔ رہے دورِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے ۔۔۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ہزاروں برس کی ہے بڑھیا یہ دنیا ۔۔۔ مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے

ہر اک دل پہ ہیں داغ ناکامیوں کے ۔۔۔ نشاں دے گیا بے نشاں کیسے کیسے

نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے ۔۔۔ ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا ۔۔۔ تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

تری بانکی چتون نے چن چن کے مارے ۔۔۔ نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے

تجھے جاں نثاروں کے تیور وہی ہیں ۔۔۔ گلے پر ہیں خنجر رواں کیسے کیسے

بنا کر دکھائے مرے دردِ دل نے ۔۔۔ تہِ آسماں آسماں کیسے کیسے

پتہ ایک نے بھی نہ منزل کا پایا ۔۔۔ بھٹکتے پھرے کارواں کیسے کیسے

یہاں درد سے ہاتھ سینے پہ رکھتے ۔۔۔ وہاں ان کو گزرے گماں کیسے کیسے

امیر اب سخن کی بڑی قدر ہوگی
پھلے پھولیں گے نکتہ داں کیسے کیسے

○

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے　　اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

پژمردہ گل ہوئے ترے گالوں کے سامنے　　سنبل ہیں پیچ پڑ گئے بالوں کے سامنے

تیروں کے پر کٹے ترے غمزے کے روبرو　　نبضیں نہ چل سکیں تری چالوں کے سامنے

عاشق نے لاکھ جمع کیا دفتر حواس　　شیرازہ کھل گیا ترے بالوں کے سامنے

ہم کیا کہ سرکشوں کی بھی پرخم ہیں گردنیں　　ان کج کلاہ گیسوؤں والوں کے سامنے

موسیٰ سے کہہ دو طور پہ جایا کریں نہ روز　　اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

پردہ انھیں سے ہے جنھیں تاب نظر نہیں　　آتے ہیں خود وہ دیکھنے والوں کے سامنے

نیرنگ صنع دیکھ تماشائے باغ کو　　کیا سرخ گل ہیں سبز نہالوں کے سامنے

کرتے ہیں عجز جن کو خدا نے دیا ہے ظرف　　شیشوں کے سر جھکے ہیں پیالوں کے سامنے

دنیا امیر کیا ہے جو ماتم کدہ نہیں

ہر دم یہاں ہیں تازہ ملالوں کے سامنے

نئی چشمِ ساقی کو موج آگئی
مری عمر کا جام چھلکا گئی

جہاں سے مجھے لائی تھی میری مر
وہیں سیر دکھلا کے پہنچا گئی

صدا خاکِ لیلیٰ سے آئی کہ قیس
مجھے تیری دیوانگی کھا گئی

خدا جانے وہ تیغ کیا وقتِ قتل
گلے مل کے بسمل کو سمجھا گئی

مرے عشق کی وجہ ناصح نہ پوچھ
طبیعت ہی تو ہے جدھر آگئی

نہ تھے تیرے مرنے کے یہ دن نعیم
خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

قیامت ہے واعظ اسی تاک میں
ادھر تو نے پی اور ادھر آگئی

نئے رنگ کے کھل گئے گل امیر
طبیعت جہاں رنگ پر آگئی

○

دم تری الفتِ پوشیدہ کا بھرنے والے
دل جلے سینہ جلے اُف نہیں کرنے والے

عشق میں جی سے گزرتے ہیں گزرنے والے
موت کی راہ نہیں دیکھتے مرنے والے

اک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے
اے غریبوں کے مزاروں پہ گزرنے والے

پھر کہاں دل کا پتہ دل میں حسیں جب آئے
گھر کبھی لے بناتے ہیں اس گھر میں ٹھہرنے والے

بولے وہ آئینہ خانہ میں عجب سیر ہے یاں
ساری دنیا کے اکٹھے ہیں سنورنے والے

جان لینے کا سلیقہ تو اجل کو آئے
جان مرنے سے بچاتے نہیں مرنے والے

چتونیں کہتی ہیں کرتا ہے جو وہ وعدۂ وصل
کیا کہا پھر تو کہو او کہہ کے مکرنے والے

قابلِ رحم قیامت میں نہ ٹھیریں گے امیر
رحم دنیا میں غریبوں پہ نہ کرنے والے

میں رو کے آہ کروں گا جہاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

رہے وہ جانِ جہاں یہ جہاں رہے نہ رہے
مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغِ شوقِ سجود
جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے

خزاں تو خیر سے گزری چمن میں بلبل کو
بہار آئی ہے اب آشیاں رہے نہ رہے

چلا تو ہوں پئے اظہارِ دردِ دل دیکھوں
حضورِ یار مجالِ بیاں رہے نہ رہے

چلا ہوں کوچۂ قاتل کو سر کے بل دیکھوں
یہ حالِ دل کا دمِ امتحاں رہے نہ رہے

دو روزہ زیست غنیمت ہے ذکرِ حق کر لے
بدن میں جان دہن میں زباں رہے نہ رہے

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

○

ابروئے یار نہ بھولے کبھی دلشاد رہے
خوب مصرع ہے یہ اللہ کرے یاد رہے

بسملوں کی نگہ یاس بُری ہوتی ہے
اک ذرا دل کو سنبھالے ہوئے جلاد رہے

طول فرقت سے مزے وصل کے سب بھول گئے
نہ وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ وہ دن یاد رہے

ہوں وہ غم دوست کہ رو رو کے دعا کرتا ہوں
درد کا دل نہ دکھے خاطرِ غم شاد رہے

ہم جو پہنچے تو لبِ گور سے آئی یہ صدا
آئیے آئیے حضرت بہت آزاد رہے

رشک ہے بعدِ فنا مجھ کو فلک سے تو یہ ہے
میں ستم کش نہ رہوں تو ستم ایجاد رہے

کیا عجب بھول گئے ہم جو کلام اپنا امیرؔ
یاد رہنے کے جو قابل نہ ہو کیا یاد رہے

○

فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اس گھر میں جا نکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

دلِ عاشق میں کیونکر عکسِ روئے دلربا ٹھہرے
جمالِ آفتاب آئینۂ شبنم میں کیا ٹھہرے

حقیقت کھول دی آئینہ وحدت نے دونوں کی
نہ تم ہم سے جدا ٹھہرے نہ ہم تم سے جدا ٹھہرے

رہے سایہ کی صورت ساتھ ہم ہر شخص کے لیکن
جدا اُٹھے جدا بیٹھے جدا آئے جدا ٹھہرے

صفیں آراستہ ہونے لگیں جب اہلِ محشر کی
جما کر ایک ٹکری حسرتوں کی ہم جدا ٹھہرے

زمینِ کوئے جاناں بھی عجب دلچسپ تختہ تھا
جہاں ٹھہرے ہمارے پاؤں مثلِ نقشِ پا ٹھہرے

امیرؔ آیا جو وقت بد تو سب نے راہ لی اپنی
ہزاروں سینکڑوں میں درد و غم دو آشنا ٹھہرے

○

جب آنکھ اس شاہِ خوباں پر پڑی ہے
نگہ تقدیر بن کر لڑی ہے

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے
کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

شبِ غم مجھ سے بیٹھا جائے کیوں کر
تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

نگاہِ ناز ہوتی ہے بر آمد
سلامی کو صفِ مژگاں کھڑی ہے

تمہارے لب ہیں باغِ حسن کے پھول
تبسم ان کی نازک پنکھڑی ہے

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سرِ شام
کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

○

عجب ناگن ہے زلف اس کی کہ جس محفل میں کھولی ہے
وہاں سے جو چلا ہے اٹھ کے اس کے ساتھ ہولی ہے

ادائیں کھیلتی ہیں رنگ تلوار اس نے تولی ہے
لہو کی چلتی ہیں پچکاریاں مقتل میں ہولی ہے

عجب عالم ہے اس کا وضع سادی شکل بھولی ہے
کھبی جاتی ہے دل میں کیا رسیلی نرم بولی ہے

بہار آئی چمن ہوتا ہے مالا مال دولت سے
نکالا چاہتی ہیں زر گرہ غنچوں نے کھولی ہے

صبا ان منہ بندھی کلیوں نے شب کو کس کی چوری کی
کہ تو نے صبح کو ایک ایک کی بقچی ٹٹولی ہے

امیرؔ ایسے شگفتہ ہیں مضامیں نازک و رنگیں
غزل کیا ہے یہ پھولوں سے بھری گلچیں کی جھولی ہے

خوشامد اے دلِ بیتاب اس تصویر کی کب تک
یہ بولا چاہتی ہے پر نہ بولے گی نہ بولی ہے

امیرؔ اس بے وفا دنیا کی صورت پر نہ تم نہ جاؤ
بڑی عیار ہے مکار ہے ظاہر میں بھولی ہے

○

دل میں جو داغ ہیں ندامت کے پھول ہیں سب یہ باغ جنت کے

دل مرا اور آرزو تیری جان صدقے ہو ایسی حسرت کے

تیری صورت بنائے بیٹھے رہے کارکن کارگاہِ صنعت کے

دونوں عالم ہوئے تہ و بالا تم سے پردے میں کیا قیامت کے

جس کو دیکھا حسین لوٹ گئے ہم تو عاشق ہیں اس طبیعت کے

اس کا نقشہ کھنچے تو اے نقاش رنگ بھرنا مری طبیعت کے

ہلدئے غنچہ کھلے پہ کہتے ہیں کیوں چکھا دئیں مزے محبت کے

جتنے تکیے میں سو رہے ہیں امیرؔ
یار ہیں سب ہماری صحبت کے

ترا کیا کام اب دل میں غمِ جانانہ آتا ہے
نکل اے صبر اس گھر سے کہ صاحب خانہ آتا ہے

نظر میں تیری آنکھیں سر میں سودا تیری زلفوں کا
کئی پریوں کے سائے میں ترا دیوانہ آتا ہے

وفورِ رحمتِ باری ہے میخواروں پہ ان روزوں
جدھر سے ابر اُٹھتا ہے سوئے میخانہ آتا ہے

لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ایسا ہے
مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے

ان ہی سے غمزے کرتی ہے جو تجھ پہ جان دیتے ہیں
اجل تجھ کو بھی کتنا نازِ معشوقانہ آتا ہے

وہ بت ہے مہرباں سب اپنا اپنا حال کہتے ہیں
لبِ خاموش تجھ کو بھی کوئی افسانہ آتا ہے

ادھر ہیں حسن کی گھاتیں ادھر ہیں عشق کی باتیں
تجھے افسوں تو مجھ کو اے پری افسانہ آتا ہے

امیر اور آنے والا کون ہے گورِ غریباں پر
جو روشن شمع ہوتی ہے تو ہاں پروانہ آتا ہے

○

نہ مست ہے نہ کوئی ہوشیار باقی ہے — حجاب کس سے اب اے چشمِ یار باقی ہے
چلے برنگِ نفس عمر بھر تو کیا حاصل — کہ منزلوں ہیں ابھی کوئے یار باقی ہے
نہ دل میں تاب نہ آنکھوں میں نور ہے لیکن — وہی تڑپ ہے وہی انتظار باقی ہے
قضا پکارتی پھرتی ہے ان کو مقتل میں — چلے اگر کوئی امیدوار باقی ہے
کہاں کہاں نہیں یارانِ رفتہ کو ڈھونڈھا — جو ہے تو ایک عدم کا دیار باقی ہے
نہ تختِ خسروِ چیں ہے نہ چترِ قیصرِ روم — مزار و سایۂ نخلِ مزار باقی ہے
مثالِ آئینہ وا ہیں مزار میں آنکھیں — ہنوز حسرتِ دیدارِ یار باقی ہے

کہیں گے اہلِ عدم کو دکھا کے داغ امیرؔ
یہی گُلِ چمنِ روزگار باقی ہے

○

بہار آئی عجب حالت ہے ان روزوں مرے دل کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی

نئے بانکے بنے ہو کچھ نئی شمشیر باندھی ہے
نگاہ حسرت آلودہ نہیں دیکھی ہے بسمل کی

حسینانِ جہاں رہتے ہیں مہماں عکس کی صورت
بنا ہے خشت آئینہ سے شاید خانۂ دل کی

گریباں پھاڑ کر سیرِ چمن کو مثلِ گل چلیئے
جنوں انگیز پھر آتی ہیں آوازیں عنادل کی

تامل سے جو دیکھا برگہائے غنچۂ و گل کو
نظر میں پھر گئیں سب صحبتیں یارانِ یک دل کی

نہ سمجھو کھیل امیرالغت کی بازی جان لیتی ہے
کہے دیتے ہیں ہم اچھی نہیں ہے دل لگی دل کی

○

لذّت جو ملی مرے لہو کی　　خنجر نے بلائیں لیں گلو کی

کی جس پہ نگاہ تجھ کو دیکھا　　ابتک تو نظر کہیں نہ چوکی

دل ہی نہ رہا امید کیسی　　جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

اب کیوں ہیں کلیم غش میں خاموش　　پہلے نہ سنبھل کے گفتگو کی

ق

کیسی ارنی کہاں کے موسیٰ　　خود دید کی اپنی آرزو کی

تھا پردہ ظاہری جو منظور　　آواز بدل کے گفتگو کی

کلفت نہ مٹی امیر دل کی
اشکوں نے ہزار شست و شو کی

○

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے
کون جانے تجھے کہاں تو ہے

لاکھ پردوں میں تو ہے بے پردہ
سو نشانوں میں بے نشاں تو ہے

تو ہے خلوت میں تو ہے جلوت میں
کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے

نہیں تیرے سوا یہاں کوئی
میزباں تو ہے میہماں تو ہے

جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی
جان کہتی ہے جانِ جاں تو ہے

رنگ تیرا چمن میں بو تیری
خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

محرمِ راز تو بہت ہیں امیرؔ
جس کو کہتے ہیں راز داں تو ہے

○

نازکی کہتی ہے تسمہ تو لگا رہنے دے
ناز کہتا ہے لگی میری بلا رہنے دے

عشق کے راز کو پنہاں کوئی کیا رہنے دے
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ چھپا رہنے دے

اے دل اس دور میں ایسی نہیں سنتا کوئی
نہ کر اس قصّے کو اب ذکرِ وفا رہنے دے

اے نمک پاش خدا کے لئے چٹکی نہ رُکے
کوئی دم اور تڑپنے کا مزہ رہنے دے

جب وہ بُت ہی نہیں جنّت میں تو جنّت کیسی
ایسی جنّت سے تو دوزخ ہیں خدا رہنے دے

سو چمن صدقے کیئے دامنِ گلچیں پہ امیرؔ
ذکر پھولوں کا یہاں بادِ صبا رہنے دے

کسی نا آشنا کا کیا شکوہ — آشنا کی جب آشنا نہ سنے
جو کسی کو برا بھلا نہ کہے — وہ کسی سے برا بھلا نہ سنے
میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو — بت ہی سن لیں اگر خدا نہ سنے
درد پر دل نثار دل پہ درد — ایسے دیکھے ہیں آشنا نہ سنے
بہت اے دل وفا وفا نہ پکار — کہیں وہ دشمنِ وفا نہ سنے
میں تو سنتا ہوں تو جو کہتا ہے — اے ستمگر مگر خدا نہ سنے

جو کوئی درد آشنا ہو امیر
ادھر آئے مرا فسانہ سنے

○

دو جہاں چھوڑ کے عشاق ترے غم میں رہے
دونوں عالم سے جدا تیسرے عالم میں رہے

آ کے بگڑی ہوئی اس باغ کی دیکھی جو ہوا
مشورے کوچ کے شب بھر گل و شبنم میں رہے

خم بھی رویا مجھے پیمانہ بھی رویا مجھ کو
جتنے تھے چھوٹے بڑے سب مرے ماتم میں رہے

اپنے بیگانے کو روتے ہی کٹی عمر امیہ
کبھی دشمن کے کبھی دوست کے ماتم میں رہے

او بندۂ بُت دیکھ خدا اور ہی کچھ ہے
بت پردہ ہیں پردے میں چھپا اور ہی کچھ ہے

اے چرخ حسینوں کی ضیا اور ہی کچھ ہے
معشوق کی چھیڑوں میں مزہ اور ہی کچھ ہے

رنگ آج تو پھولوں کا صبا اور ہی کچھ ہے
آمد ہے جو اس گل کی ہوا اور ہی کچھ ہے

قاصد بزباں اس کی بیاں اس کا نہیں ہے
دھوکا ہے تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے

آفت تو ہے وہ ناز بھی انداز بھی لیکن
مرتا ہوں میں جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

عارف سے یہ کہہ دو جو ترے فہم میں آئے
وہ سب ہے ترا وہم خدا اور ہی کچھ ہے

عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و فغاں کی
پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تجھ سے مانگوں نہ تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

غم میں گزرے تو برا عیش میں گزرے تو بھلا
نہ برا ہے کوئی دنیا میں نہ سال اچھا ہے

خوب دیکھا تو جوانی کا ہے سارا جوبن
حسن پریوں کا نہ حوروں کا جمال اچھا ہے

قوّتِ عجز سے تا کنگرۂ عرش پہنچ
رنگِ پرواز کا یہ بے پر و بال اچھا ہے

برق اگر گرمیٔ رفتار میں اچھّی ہے امیرؔ
گرمیٔ حسن میں وہ برقِ جمال اچھا ہے

○

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے
کیا ہے ہمارے دل میں بھلا جان جائیے

رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے
قربان ہونے والے کے قربان جائیے

مانی ہیں میں نے سینکڑوں باتیں تمام عمر
آج آپ ایک بات مری مان جائیے

اچھا ہوا کہ حضرتِ دل وار دھر سے گئے
کس نے کہا تھا بن کے نگہبان جائیے

کیا ہند میں کمی مے و معشوق کی امیر
شیراز جائیے نہ خراسان جائیے

○

چاہنا ہم کو تو اس کا چاہیئے
وہ ہمیں چاہے تو پھر کیا چاہیئے

کان جب آواز سنتے ہیں تری
آنکھ کہتی ہے کہ دیکھا چاہیئے

وعدہ آنے کا ہے ان سے خواب میں
خواب کب آتا ہے دیکھا چاہیئے

ترکِ لذّت بھی نہیں لذت سے کم
کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے

ہے مزاج اس کا بہت نازک امیرؔ
ضبطِ اظہارِ تمنّا چاہیئے

○

قطع ہو راہِ سفر کوچۂ قاتل آنے
تھک گیا ہوں میں الٰہی کہیں منزل آئے

ہم تہی دست لبِ گور تو پہنچے پر یوں
جس طرح لٹ کے مسافر سرِ منزل آئے

مجھ سے صدمے نہ جدائی کے اٹھیں گے یا رب
جان بھی ساتھ ہی جائے جو کہیں دل آئے

حال ہوشیاری کا بیدار دلوں سے پوچھو
ہم تو غافل گئے غافل رہے غافل آئے

یہ نیا قاعدہ دربار کا ٹھیرا ہے حضور
نذر کے واسطے ہر روز نیا دل آئے

بے نقاب آئے مجھ وہ رات کو محفل میں امیرؔ
شمع نے بڑھ کے کہا رونقِ محفل آئے

O

صلح کل ہیں ہے ابھی شرکت کیں تھوڑی سی
اور وُہ ہے پیرِ خرابات نشیں تھوڑی سی

مدد اے شوقِ سجود المدد اے شوقِ سجود
سر نہ اُٹھے ابھی باقی ہے جبیں تھوڑی سی

کوچہ و وہم ہے تاریک، بھٹکنے کا ہے ڈر
چاہیئے روشنیٔ شمعِ یقیں تھوڑی سی

ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ جہاں
اسی انداز سے کہدے کہ نہیں تھوڑی سی

ہدیۂ دوست سمجھ کر میں ہوا شکر گزار
روکھی سوکھی جو ملی نانِ جویں تھوڑی سی

عذرِ تقصیر سے تقصیر ہی اچھی تھی مجھے
بڑھ گئی اور تری چینِ جبیں تھوڑی سی

○

وہ چاٹ دو، واں کہے نہ مذمت شراب کی
واعظ کے منہ پہ مُہر لگا دوں گلاب کی

گلشن میں بلبلیں ہیں ہماری طرح سے مست
ساقی گلابیاں ہیں کہ قلمیں گلاب کی

موسیٰ کو یہ پڑی ہے کہ برقِ جمال تھی
اک تہ اُتر گئی تھی تمہارے نقاب کی

تا سب پہ شانِ عفو نمایاں ہو روزِ حشر
چُن لی ہے اس نے فرد ہمارے حساب کی

وہ مست بے خبر ہے نہ ۔۔ سمجھے گا واعظو
کہئے امیر سے نہ عذاب و ثواب کی

○

مجھ مست کو مے کی بُو بہت ہے
دیوانے کو ایک ہُو بہت ہے

موتی کی طرح جو ہو خداداد
تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے

بے کیف ہو مے تو خم کے خم کیا
اچھی ہو تو اک سبو، بہت ہے

کیا وصل کی شب میں مشکلیں ہیں
فرصت کم آرزو بہت ہے

کیا غم ہے امیر اگر نہیں مال
اس وقت میں آبرو بہت ہے

○

مقامِ وجد ہے اے دل کہ بزمِ یار میں آئے
بڑے دربار میں پہنچے بڑی سرکار میں آئے

مرے گھر کی طرف بھی عالمِ مستی میں آ نکلے
ترنگ ایسی کبھی یا رب مزاجِ یار میں آئے

بہت مشتاق ہیں مست آمدِ فصلِ بہاری کے
الٰہی کوئی بلکہ کوہ سے گلزار میں آئے

نظر آتا ہے ہر گل زر بکف بہرِ خریداری
چمن میں تم کہ یوسف مصر کے بازار میں آئے

خلش میں کیا مزہ ہے تیرے دیوانوں کو کیا جانے
جب آئے پا برہنہ وادیٔ پُر خار میں آئے

○

تیغِ قاتل پہ ادا لوٹ گئی
رقصِ بسمل پہ قضا لوٹ گئی

ہنس پڑے آپ تو بجلی تڑپی
بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی

پس گیا چشمِ سیہ پر سرمہ
پائے رنگیں پہ حنا لوٹ گئی

اس روش سے وہ چلے گلشن میں
بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی

وار خالی نہ گیا قاتل کا
بچ رہا میں تو قضا لوٹ گئی

○

بیجا نہیں خزاں میں یہ نالے ہزار کے
مظلوم داد خواہ ہیں خونِ بہار کے

رکھنا نہ مجھ کو ساتھ دلِ بے قرار کے
ہو اور اک مزار برابر مزار کے

پیری میں کس مزے کو جوانی کے روئیے
سو داغ دے گئے ہمیں دو دن بہار کے

یک رنگ تھے وہ ہم کہ دو رنگی نہ کی پسند
پہنا کفن تو جامۂ ہستی اُتار کے

کلیاں جنھیں گلوں کی سمجھتی ہے عندلیب
وہ بند ہیں نقابِ عروسِ بہار کے

○

گُنہ باری میں مقر ہو عجز کا
جیت لے بازی کو ہمت ہار کے

نعمتِ کونین سے دل سرد ہے
ایک بھوکے ہیں ترے دیدار کے

تیرے منہ سے ہاں نہیں دونوں ہیں خوب
صدقے اس انکار اس اقرار کے

شیخ کعبہ میں برہمن دیر میں
سب ہیں درباری ترے دربار کے

داغہائے عشق کھلاتے نہیں
پھول ہیں کس بے خزاں گلزار کے

○

ہم اس کے عشق میں صبر و قرار کھو بیٹھے — قدیم دوست ہمیشہ کے یار کھو بیٹھے
سوال وصل کا کرنے سے یہ ہُوا حاصل — کہ آسرا ترے امیدوار کھو بیٹھے
وفا کا عہد کیا دے کے دل تو یہ پایا — کہ پھیر لینے کا بھی اختیار کھو بیٹھے
سرِ خدنگِ نگہ آ چکا تھا طائرِ دل — تم آنکھ پھیر کے اپنا شکار کھو بیٹھے
ادا وہ کون سی تھی جس پہ ہو گئے فقیر امیرؔ
ذرا سی بات پہ صبر و قرار کھو بیٹھے

○

گلشن میں سرو فوج میں مثلِ نشاں رہے — عالم میں سربلند رہے ہم جہاں رہے
نیرنگ ان کی شانِ تجلّی کے دیکھئے — اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے
یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہو گئے تمام — کشتی میں جیسے ساکنِ کشتی رواں رہے
تا حشر ان کو ناز مبارک مجھے نیاز — مانندِ عشق حسن بھی یا رب جواں رہے
صیّاد ادھر خلاف ادھر باغباں امیرؔ
ہم بارِ خاطرِ قفس و آشیاں رہے

○

جتنی کمی کہ نامہ سیاہی میں رہ گئی　　اتنی ہی دیر عفوِ الٰہی میں رہ گئی
ابلیس ادھر جھکا تو مرا دل ادھر جھکا　　دو ہاتھ چل کے رہزن و راہی میں رہ گئی
صد شکر منہ سے نام محمدؐ نکل گیا　　بات اپنی بارگاہِ الٰہی میں رہ گئی
اللہ رے انقلاب محل ہے نہ قصر ہے　　تربت فقط عمارتِ شاہی میں رہ گئی

پردے کو اس کی ذات سے کیا کام تھا امیرؔ
چھپ کر صفاتِ لامتناہی میں رہ گئی

○

یہ گالی جو اسے دلہ بامل رہی ہے　　دعا دی تھی اس کی سزا مل رہی ہے
لگا چاہتی ہے کوئی آگ تازہ　　شرارت سے ان کی حیا مل رہی ہے
بھری زہر سے ہیں عیادت کی باتیں　　مریضوں کو اچھی دوا مل رہی ہے
بہار آئی ہے چہچہاتے ہیں بلبل　　قیامت صدا سے صدا مل رہی ہے

امیرؔ التجا کیوں کروں چارہ گر سے
اذیت میں لذت سوا مل رہی ہے

○

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

آدمی زاد ہیں دنیا کے حسیں لیکن امیر
یار لوگوں نے پری زاد بنا رکھا ہے

جان بھی ہجر میں دے دیتے مگر ہم نے امیر
کسی موقع کے لیئے اس کو لگا رکھا ہے

○

آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے
چلیئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے

ہم تم چمن میں چل کر جب چار دن رہے ہیں
بلبل میں اور گل میں تکرار ہو گئی ہے

انگور میں بھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

جس نے لکھا ہے نامہ اس عالم آشنا کو
جانے کو جان میری تیار ہو گئی ہے

اک بات سہل سی ہے مرگ اے امیر لیکن
دشوار سمجھے ہیں سب دشوار ہو گئی ہے

○

یہ ظاہر ہے دلِ اندوہگیں سے — کہ ظالم چوٹ کھا آیا کہیں سے
مقابل آئینہ ہے آنکھ اٹھاؤ — ہنسو بولو کچھ اپنے ہمنشیں سے
یہ کس کا آستانہ ہے کہ سجدے — گرے پڑتے ہیں آغوشِ جبیں سے
صبا آتی ہے اٹھلاتی ہوئی آج — کوئی پیغام لائی ہے کہیں سے

جفائے آسماں کی داستانیں
سنو گورِ غریباں کی زمیں سے

○

آنکھوں کے آگے آکے کھڑی ہوگئی وہ شکل — دم بھر جہاں پلک سے پلک آشنا ہوئی
ہے بخشنے نہ بخشنے میں اس کو اختیار — تو ہے گناہ گار کہے جا خطا ہوئی
گھبرا رہے ہو حشر میں کیوں اس قدر امیر — اتنی ہی سی تو بات ہے کہدو خطا ہوئی
غافل نزول ہی تو کمالِ عروج ہے — ق — خاکِ فنا ہی منزلِ آبِ بقا ہوئی

نقطہ کی سیر دائرۂ معرفت میں دیکھ
تھی ابتدا جہاں سے وہیں انتہا ہوئی

○

ہر کلی کہتی ہے کھل کر ترے دیوانے سے　　دیکھ نکلی ہے پری صبح کے پری خانے سے
ساقیا جاتے ہیں پیاسے ترے میخانے سے　　گھونٹ دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے
لامکاں کے جو کتابوں میں لکھے ہیں اوصاف　　ملتے جلتے ہیں وہ کچھ کچھ مرے ویرانے سے
زیست کا لطف تو یاروں کے ہی دم تک ہے امیر　　بیٹھ جاتا ہے دلِ احباب کے اُٹھ جانے سے

ذکر ہو کس دلِ وحشی نے کیا ہے کہ امیر
وہی آواز چلی آتی ہے ویرانے سے

○

فسانہ رہ گیا حسن و محبت کا زمانہ میں　　نہ مجنوں ہے نہ لیلیٰ ہے نہ ناقہ ہے نہ محمل ہے
ملنا نہیں کھینچ دے یارب زمینِ کوئے جاناں کی　　کہ میں ہوں ناتواں اور دن ہے آخر دور منزل ہے
امیرِ خستہ جاں کی مشکلیں آساں ہوں یارب　　تجھے ہر بات آساں ہے اسے ہر بات مشکل ہے
اسی جوہر سے ہے ہر دل عزیز آئینہ دنیا میں　　اسی کی شکل بن جاتی ہے یہ جس کے مقابل ہے

امیر اللہ حافظ ہے ہجومِ ناز میں دل کا
کہ سو جلاد ہیں خنجر بکف اور ایک بسمل کا

○

خبر ہے نعش پہ کس بے وفا کے آنے کی — کہ جان ابھی سے ہے بیتاب جا کے آنے کی

شبِ وصال ہیں اس شوخ کو پلا کے شراب — میں آہیں روک رہا ہوں حیا کے آنے کی

ہزار برق نے چل پھر کے مشق کی لیکن — ادا نہ آئی ترے مسکرا کے آنے کی

نہ چوک وقت کو پا کر کہ ہے یہ وہ معشوق — کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی مجھے
ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

○

بالائے آسماں تھے ہم عرش آشیاں تھے — کوئی نہ تھا وہاں تھے اب کیا کہیں کہاں تھے

خاموش ہیں لحد میں جو لوگ خوش بیاں تھے — غنچوں کے جو دہن تھے بلبل کی جو زباں تھے

دیکھا خزاں میں ہم نے بلبل کے آشیاں کو — دو چار پر شکستہ دو چار استخواں تھے

کمزور پا کے ہم کو کیا بل کی لے رہے ہو — ہم بھی تو نوجوانو آخر کبھی جواں تھے

پہنچے جو ہم عدم کو اہلِ حرم یہ بولے
مدت کے بعد آئے اتنے دنوں کہاں تھے

○

دل کو اب کب قرار آتا ہے — سن لیا ہے کہ یار آتا ہے
چین آتا نہیں مزار میں آج — کون سوئے مزار آتا ہے
تم کو آتا ہے پیار پہ غصّہ — مجھ کو غصّے پہ پیار آتا ہے
جائے شکوہ مری زباں پہ امیرؔ — شکر بے اختیار آتا ہے

○

طرفہ مستی لبِ میگوں نے ترے پائی ہے
موجۂ مے نگۂ چشمِ تماشائی ہے
تنگ آ کر ترے بیمار نے بیتابی میں
جب مسیحا کو پکارا ہے اجل آئی ہے
موت کو ہم جو حیاتِ ابدی سمجھے ہیں
ملک الموت کو بھی نازِ مسیحائی ہے
قتل کرنا اک اشارہ ہے جلانا اک بات
سحر ان آنکھوں میں، ہونٹوں میں مسیحائی ہے

○

حشر میں جس نے کہا بندہ خطاکاروں میں ہے
رحمت اسکی بولی چل تو کن گنہگاروں میں ہے؟

میں ہوں عاجز اور اس کو عاجزی محبوب ہے
بے نیازی اسکی میرے نازبرداروں میں ہے

حشر کے دن دیکھ کر آغوشِ رحمت میں مجھے
پوچھتی ہے خلق تو کس کے گنہگاروں میں ہے

ہے صدا حاتم کی در پر میرے آقا کے امیر
یہ خدا رکھے عجب دربار درباروں میں ہے

○

مرے دل میں پا کے جگہ نئی ترے رخ کی جلوہ گری رہی
نہ کہیں چلی نہ کہیں پھری اسی شیشہ میں یہ پری رہی

دل اگرچہ غم سے فگار ہے مگر اب بھی باغ و بہار ہے
اسی شاخ کا یہ شعار ہے کہ شگفتہ ہو کے ہری رہی

جو بڑے بڑے تھے جہاں کشاں انھیں کیا فلک نے مٹا دیا
نہ عروجِ چترِ شہی رہا نہ ضیائے تاجِ زری رہی

عجب اشتیاق امیر تھا اسے دید طرزِ خرام کا
کہ زمین کوچۂ مہ لقا تہِ پائے کبک دری رہی

○

میں ہوں وہ عندلیب ہوا جب ترانہ سنج
جتنے کھلے تھے گل ہمہ تن گوش ہو گئے

ساقی شراب اور خراباتیوں کو دے
ہم تیری چشم مست سے مدہوش ہو گئے

مدت سے سر امانت شمشیر یار تھا
ہم ذبح ہو کے آج سبکدوش ہو گئے

افسردہ داغ دل ہوئے پیری میں کیا امیرؔ
گویا چراغ صبح کو خاموش ہو گئے

○

کس بُرے حال سے عاشق ترے اے جان گئے
چار حیران گئے چار پریشان گئے

دل میں تم آنکھ میں تم کعبہ میں تم دیر میں تم
تم جہاں چاہو چھپو ہم تمھیں پہچان گئے

حق شناسی کی حقیقت کو انھیں نے جانا
اے امیر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے

وحشتوں کے وہ کہاں لطف اسیری میں امیرؔ
اب وہ میدان وہ سنسان بیابان گئے

○

امیر رونق ہے اُمت شہ زماں کے لیئے
زمین خاک اڑاتی ہے آسماں کے لیئے

غضب کی لاگ تھی کمبخت برق کو مجھ سے
چمن کو پھونک دیا ایک آشیاں کے لیئے

کمر لچکتی ہے خنجر سنبھل نہیں سکتا
اور آپ آئے ہیں عاشق کے امتحاں کے لیئے

حضور اس کے ہیں دشمن بہت اجازت ہو
تو پاسبان بنوں شب کو پاسباں کے لیئے

○

زمانہ ہو گیا مدہوش چشم مستِ دلبر سے
تماشا ہے چھلکی محفل کی محفل ایک ساغر سے

چمن میں جا کے یہ گل رونئی چالیں دکھاتے ہیں
گلوں سے تن کے چلتے ہیں اکڑتے ہیں صنوبر سے

یہ روز و شب نہیں کٹتے ہیں غافل زندگانی کے
نکل جاتا ہے ہر روز اک دو ورقہ تیرے دفتر سے

مقدر ہی جو واژون ہو تو کام آتی ہے کب دولت
ہمیشہ خاک چھنوائی فلک نے کیمیا گر سے

○

اس دل پہ ہزار جان صدقے
جس دل میں ہے آرزو تمھاری

مشتاق سے دور بھاگتی ہے
کتنی ہے اجل میں خو تمھاری

دو دن میں گلو بہار کیا کی
رنگت وہ رہی نہ بُو تمھاری

آنکھوں سے کہو کمی نہ کرنا
اشکوں سے ہے آبرو تمھاری

○

جتنے کہ تیر ترکشِ دلبر میں رہ گئے
اتنے ہی حوصلے دلِ مضطر میں رہ گئے

ساقی چمن میں آتے ہی رخصت ہوئی بہار
میخوار فکرِ شیشہ و ساغر میں رہ گئے

○

لی کاروانِ گل نے خزاں میں عدم کی راہ
بلبل پھڑک پھڑک کے گلستاں میں رہ گئے

لوٹا ستمگروں نے مگر پھر بھی اے امیرؔ
مضموں ہزار ہا مرے دیواں میں رہ گئے

○

قبلۂ دل کعبۂ جاں اور ہے
سجدہ گاہِ اہلِ عرفاں اور ہے

ہو کے خوش کٹواتے ہیں اپنے گلے
عاشقوں کی عیدِ قرباں اور ہے

روز و شب یاں ایک سی ہے روشنی
دل کے داغوں کا چراغاں اور ہے

کعبہ در محرابِ ابرو اے امیرؔ
اپنی طاعت اپنا ایماں اور ہے

○

آنکہ مجھ سے دل ملے اغیار سے — یار! درگذرا میں ایسے پیار سے
لے چلی غربت جو صحرا کی طرف — مل کے ہم روئے در و دیوار سے
تھے وہ موسیٰ غش پہ غش آیا جنھیں — یاں تو آنکھیں کھل گئیں دیدار سے
ہر قدم پر سو طرح کی مستیاں — ٹپکی پڑتی ہیں تری رفتار سے

○

دیر میں کون ہے کعبہ میں گزر کس کا ہے
یار کا گھر یہ اگر ہے تو وہ گھر کس کا ہے
تیر پہ تیر لگاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے
دل یہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے
تو ہی یاں رہنے کو آیا ہے نہیں او غافل
جو ہے دنیا میں مسافر ہے یہ گھر کس کا ہے
لاکھ لاکھ اس شہرِ خوباں کے ہیں احسان امیرؔ
عشق منزل تلک اس طرح گزر کس کا ہے

○

نہ زر ہے کام نہ احباب ہے نہ دولت ہے — یہ سب رہیں نہ رہیں عالمِ شباب رہے
نہ مجھ کو آئے نہ ان کو حساب بوسوں کا — یہ لین دین الٰہی علی الحساب رہے
خدا کا نور چھپانے سے چھپ نہیں سکتا — جہاں رہے وہ عیاں مثلِ آفتاب رہے

○

چار سر پھوڑتے ہیں چار کھڑے روتے ہیں
مجلسِ وعظ نہیں بزم ہے میخواروں کی
اک ذرا پاؤں اٹھائے ہوئے لے توسنِ عمر
مدّتوں سے خبر آئی نہیں کچھ یاروں کی
ہمہ تن فکر ہوں میں فکرِ غزل کیا ہو امیرؔ
شعر گوئی نہیں خاطر ہے فقط یاروں کی

○

اک ذرا وحشتِ دل بڑھ کے خبر تو لینا — خاک کیا نجد میں مجنوں نے اڑا رکھی ہے
جا کے لے آئے اُسے پھر ہیں نہ جھگڑوں نہ لڑوں — مختصر بات ہے ناصح نے بڑھا رکھی ہے
نزع میں آؤ تو اس کو بھی تصدق کر دیں — جان اک قدرِ رمق ہم نے بچا رکھی ہے

○

دلا! ہم سے گلہ اس دلربا کا — شکایت آشنا سے آشنا کی
عدم میں کیا تماشہ ہے کہ دن رات — چلی جاتی ہے سب خلقت خدا کی
دکھے کیونکر نہ دل آوازِ نے سے — صدا ہے یہ کسی دردِ آشنا کی

○

کسی کروٹ آیا شبِ غم نہ چین — تڑپتے تڑپتے سحر ہو گئی
الٰہی شبِ غم میں اتنا تو ہو — کوئی جھوٹ کہدے سحر ہو گئی
ہمیں سر پٹکتے ہی گزری امیرؔ — یوں ہی عمر ساری بسر ہو گئی

○

بہ قیدِ ہجر و غم سے کشتی جانِ حزیں نکلی
کہیں بیٹھی، کہیں اچھلی، کہیں ڈوبی، کہیں نکلی
زمانہ ہو گیا موجود جس دن ہاں کہا تو نے
ہوا نابود عالم جب ترے منہ سے نہیں نکلی
تعلّی میں کمی کی کب ہماری طبع عالی نے
بنایا آسماں جب شعر کی کوئی زمیں نکلی

○

دل میں آکر نہ دل سے پھر نکلے — تم تو ارمان بن گئے دل کے
داغ افسردہ ہو چلے دل کے — جھلملائے چراغ محفل کے
ہم سے سیکھیں تو طرزِ نالہ کشی — پھول منہ چوم لیں عنادل کے

○

نگاہِ لطف بھی خالی نہیں ہے شوخی سے — کسی ادا کو تو رکھ چھوڑیے حیا کے لئے
یہ کس کے وصل کی ہے آرزو کہ یاس بھی اب — دعائیں مانگ رہی ہے مری دعا کے لئے
امیرؔ کعبہ کو جاتا ہوں ہیں تو دیر سے بُت — پکارتے ہیں اِدھر بھی ذرا خدا کے لئے

○

رندو جو ملو حضرتِ واعظ سے تو دب کے
سمجھو کہ بزرگوں میں ہیں یہ بنت عنب کے
باقی ہے امیرؔ اب تو فقط جان کا جانا
ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے
قرآں میں امیرؔ آئے ہیں حوروں کے جو اوصاف
در پردہ وہ انداز ہیں سب حسنِ طلب کے

○

حسیں تو ہے وہ مروّت نہیں اگر نہ سہی — غضب کی آنکھ تو ہے لطف کی نظر نہ سہی
مری تپش سے مرے دل کی بیقراری ہے — تمام خلق ہے واقف اُنھیں خبر نہ سہی
تمھاری ایک نظر میں تو کام ہوتا ہے — بس اک گھڑی کے لئے آؤ عمر بھر نہ سہی

○

درِ کریم پہ محشر میں تاکہ راہ ملے — گناہ گاروں میں چھپ چھپ کے بے گناہ ملے
دمِ اخیر تو ظالم ذرا نگاہ ملے — کچھ اس غریب مسافر کو زادِ راہ ملے
امیرؔ میکدہ معرفت کو یوں جاویں — کہ راہ میں کوئی مسجد نہ خانقاہ ملے

○

جلوہ گر یار مگر قتل گہِ عام میں ہے
جب بلاتا ہوں میں سنتا ہوں قضا کام میں ہے
آنکھ خالی نہ دکھا لطف بھی کر اے ساقی
جام ہی جام ہے یا مے بھی کہیں جام میں ہے
نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیرؔ
یہ بڑا حسن خدا داد مرے نام میں ہے

○

آج تو دعوتِ مے آپ کو کرنی ہوگی
رندیوں حضرتِ واعظ نہیں ہٹنے والے

شان اللہ کی اِس بزم میں ناصح بھی ہیں چپ
بُت بنے بیٹھے ہیں ہر بات کو رٹنے والے

رہنے دو تم ابھی دیوان کو چھانٹو نہ امیرؔ
آپ چھٹ جائیں گے جو شعر ہیں چھٹنے والے

○

پھول تو سب باغ میں سوکھ کے کانٹا ہوئے　　گلبدنوں کی بہار دیکھیے کب تک رہے
نرگسِ شہلا ہے مست، جامے سے باہر ہیں گل　　حسنِ عروسِ بہار دیکھیے کب تک رہے
روز نئے دل امیرؔ پھنستے ہیں جا کر وہاں　　یار کو شوقِ شکار دیکھیے کب تک رہے

○

لالے کی مانند ہم اِس باغ میں　　داغ لے کر آئے تھے لے کر چلے
پہنچیں گے اِس بزم میں عشاق ہی　　اور یوں چلنے کو دنیا بھر چلے
رہنے کب دنیا میں آئے تھے امیرؔ　　سیر کر لی اور اپنے گھر چلے

○

آئینہ دیکھنے دو ان کو ۔۔۔ امیرؔ
دیکھنا اور ہی صورت ہو گی
ہم بھی محشر میں طلب ہوں گے امیرؔ
کیا قیامت ہیں قیامت ہو گی

○

نظر بھر کے دیکھا یہ کس مست نے
کہ سرشار محفل کی محفل ہوئی
پڑھا ماعرفناک برسوں امیرؔ
تو کچھ معرفت اس کی حاصل ہوئی

○

حجابِ نور ایسا درمیاں ہے
عیاں ہو کر وہ آنکھوں سے نہاں ہے
صدا یہ تیشۂ فرہاد کی تھی
ارے تیری مشقت رائیگاں ہے

○

مل گئیں ہم سے نگاہیں یار کی
ہو گئیں آپس میں باتیں پیار کی
اے امیرؔ اس کی لگاوٹ پہ نہ جا
مار ڈالیں گی نگاہیں پیار کی

○

زیرِ گیسو شوخئ چشمِ پری زاد اور ہے
اس ختن میں طرزِ جست و خیزِ آہو اور ہے
مل گیا ہوں تجھ میں میں ہر چند مثلِ آب و رنگ
شوق کہتا ہے ابھی میں اور ہوں تو اور ہے

○

آئینہ سامنے آتا ہے عوض لینے کو
ہوشیار او مرے دیوانہ بنانے والے
کیسی راہِ عدم آباد ہے ہموار امیرؔ
چین سے سوتے چلے جاتے ہیں جانے والے

○

ہم کو ہستی میں غریب الوطنی لائی ہے
اصل میں ہیں عدم آباد کے رہنے والے
سادہ سمجھو نہ انھیں رہنے دو دیواں میں امیرؔ
یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے

○

آنکھ اس کی یہ کیونکر کہوں مخمور نہیں ہے
ہاں کیفِ جوانی سے ابھی چور نہیں ہے
ہر چند بتوں سے ہے بہت دور ترحم
اللہ کی قدرت سے مگر دور نہیں ہے

○

دیکھ لے گا مری حالت جو محبت میں تو پھر
کوئی کمبخت ہی ہو گا جسے الفت ہو گی
کبھی آئے گا وہ دل میں کبھی آنکھوں میں امیرؔ
یہی خلوت مری ہو گی یہی جلوت ہو گی

○

چاندنی میں جو وہ آجاتا ہے
چاند کو داغ لگا جاتا ہے
دل لگی سمجھے ہو آنا دل کا
جان جاتی ہے جب آجاتا ہے

○

عکسِ آئینہ سے یہ ظاہر ہے — تو ہی اوّل ہے تو ہی آخر ہے
کوئی مہماں سرا ہے یہ دنیا — جو ہے اس گھر میں وہ مسافر ہے

○

ایک سیدھی نگاہ پر تیری — لاکھ بانکوں کا بانکپن صدقے
یاد آتا ہے ان کا یہ کہنا — تجھ پہ ہیں اے امیرؔ من صدقے

○

ہاتھ طوقِ گردنِ مینا کئے — میکدہ میں ہم مزے لوٹا کئے
حضرتِ ناصح یہاں آئے تھے آج — دیر تک کچھ بیٹھے جھک مارا کئے

○

یہ کس بیدرد کس ظالم پہ اپنا دم نکلتا ہے
یہ رہ رہ کر کلیجہ چٹکیوں سے کون ملتا ہے
عجب تقدیر پائی ہے امیرؔ اس دار دنیا نے
نہیں آتا پھر اس گھر میں جو اس گھر سے نکلتا ہے

○

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو — اور معشوقوں کی ہوتی ہے اجازت کیسی

○

لو عفوِ معاصی کی لگائے رہیں عاصی   رحمت کو بہت آتے ہیں بخشش کے بہانے
خاموش چلے جاتے ہیں دنیا سے ہزاروں   کیا جانئے کیا کہہ دیا چپکے سے قضا نے

○

اب آؤ زندگی مستعار جاتی ہے   کرو نہ غم نے کہ فصلِ بہار جاتی ہے
رواں ہے نکہتِ گل کی طرح یہ عہدِ شباب   پلا شراب کہ ساقی بہار جاتی ہے

○

جو ہے بہار اس کو خزاں کا خطر بھی ہے   اے باغباں سبنت کی تجھ کو خبر بھی ہے
کونین میں ہے جلوۂ حسنِ جمالِ دوست   ہے ایک روشنی کہ ادھر بھی ادھر بھی ہے

○

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے
خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے
خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیرؔ
کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

○

نہ نور پر نہ پری پر نگاہ پڑتی ہے　　تجھی پہ آنکھ بس اے رشکِ ماہ پڑتی ہے
وہ چھپ کے گھر سے نکلتے ہیں یوں کہ دامن پر　　نہ گردِ راہ نہ گردِ نگاہ پڑتی ہے

○

نہ ہو جس میں تجلّی تجھ سے محبوبِ دو عالم کی　　وہ جنّت جل کے یارب خاک ہو جائے جہنّم کی
سوا خورشید رویوں کے کسی پر میں نہ مائل ہوں　　الٰہی دے مجھے ذرّے کا رتبہ آنکھ شبنم کی

○

ہم اور معرکۂ امتحاں سے ٹل جاتے؟　　جواب پاؤں جو دیتے تو سر کے بل جاتے
قبولِ خاطرِ روشن دلاں اگر ہوتے　　امیرؔ نور کے سانچے میں شعر ڈھل جاتے

○

زبانِ تیشہ یہ دیتی تھی کوہ کن کو صدا　　جو سر فروش ہو وہ اپنی جان پر کھیلے

○

ضعف سے گو ٹھوکریں کھاتے ہیں اٹھتے بیٹھتے
پر ترے در تک پہنچ جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے
رسم نے ملنے کی کھوئی عید کی ساری خوشی
تین دن تک پاؤں رہ جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

○

بے خود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے — پہروں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے
اس مرقع میں عجب نیرنگیاں ہیں حسن کی — جب نظر اٹھی لڑیں آنکھیں نئی تصویر سے

○

ہر گنہگار کو ہے آس الٰہی تیری — عام ہے ہر صفت لاتناہی تیری
ہم فقیر اپنی فقیری میں شب روز ہیں مست — تجھ کو اے شاہ مبارک رہے شاہی تیری

○

بیعتِ پیرِ مغاں طرفہ مزا دیتی ہے — سلسلہ ساقیِ کوثر سے ملا دیتی ہے
کیجئے غور تو دولت بھی پیمبر ہے امیر — کہ امیروں کو خدا سے یہ ملا دیتی ہے

○

ہر گھڑی دل میں نظر آتی ہیں کیا کیا صورتیں — رات دن عالم دکھاتا ہے یہ جامِ جم نئے
حسنِ روز افزوں بھلا دیتا ہے پہلے قاعدے — روز ہو جاتے ہیں اس محفل میں جا کر ہم نئے

○

عشق میں جینے کے بھی لالے پڑے — ہائے کس بیدرد کے پالے پڑے
کس نگہ نے کر دیا عالم کو مست — ہر جگہ لاکھوں ہیں متوالے پڑے

○

لطف جب ہو کہ ادھر ہاتھ میں بوتل آئے — اس طرف جھوم کے گلزار میں بادل آئے
طالبِ مرگ بھی ہیں منتظرِ یار بھی ہیں — دیکھئے کون شبِ ہجر میں اوّل آئے

○

جو چاہیے سو مانگئے اللہ سے امیرؔ — اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال سے

○

ہم ترے کشتۂ رفتار ہیں کیا ہم کو خبر — کب پھنکا صور کب اے یار قیامت آئی

○

شب کو ہوتا ہے وہ جو بے پردہ — چاندنی سیرِ بام کرتی ہے

○

کیا کہیں گے کوئی محشر میں جو پوچھے گا امیرؔ — کیوں نہ بگڑی ہوئی باتوں کو بنانے آئے

○

بے چشمِ مستِ یار نہیں لطفِ مے کشی — اب انجمن سے شیشہ و ساغر اُٹھائیے

○

کشتیٔ عمر کا انجام ہمیں یاد آیا — کھا کے چکر کوئی کشتی جو کہیں بیٹھ گئی

پایا کسی نے سرِّ محبت نہ آج تک — افسانہ عشق کا خبرِ نارسیدہ ہے

خدا ہمت اگر دیتا تو اپنے قتل کی چالیں — کسی قاتل کو سکھلاتے کسی خنجر کو سمجھاتے

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم — جو گُل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

کہاں فلاح کہ اب چاہتا ہے چرخِ دنی — درِ بخیل پہ حاتم امیدوار آئے

آتا نہیں نظر کچھ گو سامنا ہے اس کا — کیا بیچ میں تحیر پردہ کیے ہوئے ہے

شاعر ہیں اس زمانے کے دریوزہ گر امیر
نکلے ہیں بھیک مانگنے دیواں بغل میں ہے

کہاں دیر و حرم میں عشق مشرب — یہ لوگ آزاد ہیں قیدِ مکاں سے

○

خلعتِ روزِ ازل بے سر و سامانی ہے　　خاص ملبوس مرا جامۂ عریانی ہے

○

گھڑیوں روئے ہیں ہم امیرؔ لہو　　زخم کوئی جو مسکرایا ہے

○

پھول جھڑتے نہیں خزاں میں امیرؔ　　روٹھے جاتے ہیں گل گلستاں سے

○

ہزار طوطی و بلبل نے مشق پیدا کی　　نہ اس کو آئی نہ اس کو مری زباں آئی

○

خاکی نژاد خاک کے اندر چلے گئے　　جس گھر سے آئے تھے پھر اسی گھر چلے گئے

○

تذکرہ کچھ تو کیا میری پریشانی کا　　آج الجھے وہ بہت زلف کی سرگوشی سے

○

موت آئے بادہ آئے یا قیامت ہو امیرؔ
اب یہی دو تین جینے کے سہارے رہ گئے

○

عجب رسائی قسمت ہے اے حنا تیری   چمن جو چھوٹ گیا دستِ نازنیں میں رہی

○

جنت سے جو طالب ہیں سدھاریں سوئے جنت   اپنے نہ قدم کوچۂ دلبر سے بڑھیں گے

○

برائی مری سن کے غیروں سے بولے   یہ سب سچ مگر ہائے کیا آدمی ہے

○

بتوں کی الفت سے باز آؤ خدا سے پیری میں لو لگاؤ
امیرؔ دنیا سے ہاتھ اٹھاؤ ضرور فکرِ مآل بھی ہے

○

دن جوانی کے گئے پیری سفر کا وقت ہے   رات گذری چونک اے غافل سحر کا وقت ہے

○

میرِ محفل جب نہیں ہوتا   اٹھتے جاتے ہیں لوگ محفل سے

○

کھلتا نہیں کہ اس کے کوچہ کا کیا پتہ ہے   میں دل سے پوچھتا ہوں دل مجھ سے پوچھتا ہے

○

تھا جو کل تک کسی کے زانو پر — آج وہ سر ہے اور زانو ہے

○

ایک مست کا خیال جو ہنگامِ خواب ہے
جھونکوں میں نیند کے مجھے کیفِ شراب ہے

○

آساں نہیں ہے دام سے دنیا کے چھوٹنا — یہ اک بڑے حکیم کا باندھا طلسم ہے

○

پھر نہ کہنا امیر کو لاؤ — اب وہ تیری گلی سے جاتا ہے

○

وہ سنتا نہیں حالِ دل اے امیرؔ — کہانی سی کب تک کہا کیجیے

○

خیر تم پر نہیں ہے زور اپنا — مر مٹیں گے یہ اختیار تو ہے

○

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمھاری — جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمھاری

○

اے طولِ زمانۂ اسیری   بلبل کہیں گل کو بھولتی ہے؟

○

ہوں وہ حسرت زدہ کہ در پہ مرے   یاس امیدوار بیٹھتی ہے

○

وہ جلوہ دیکھ کر جب طور پر موسیٰ کو غش آیا
تو آئی غیب سے آواز دیکھا ہم نہ کہتے تھے

○

غیروں کے حال پر تو بہت لطف ہے تجھے   ہم پر بھی لطف حال ہمارا بھی غیر ہے

○

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل   اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

○

اب تو آجاؤ دم ہے آنکھوں میں   ناامیدانہ اک نگاہ سہی

○

شورِ محشر امیر کو نہ جگا   سو گیا ہے غریب سونے دے

○

ہے آج جو سرگزشت اپنی   کل اس کی کہانیاں بنیں گی

○

امیرؔ اک ذرا دیکھے بھالے ہوئے   محبت میں دل کو سنبھالے ہوئے

○

کچھ ایسے رنگ سے دیکھا تڑپ کے قاتل کو
کہ موت گرد مرے ہو کے بے قرار پھری

○

ہم فقیروں کو کہاں حوصلۂ وصل امیرؔ   مہرباں اس کو جو پایا تو کبھی جا بیٹھے

○

ہم قتل یوں ہوئے نہ کسی کو خبر ہوئی   قاتل کی آستیں بھی لہو میں نہ تر ہوئی

○

دل کی تڑپ یہی ہے تو ضبط امیرؔ کب تک   بے اختیار اک دن فریاد کر اٹھو گے

○

چھپتا ہے دل کا رنگ کہیں ضبطِ آہ سے   حسرت ٹپک رہی ہے ہماری نگاہ سے

○

کہا یہ اس نے مجھ کو ذبح کر کے — تڑپنے دو یہ حسرت بھی نہ رہ جائے

○

اور اک بات حسینوں کی نرالی سنئے — دیجئے ان کو دعائیں بھی تو گالی سنئے

○

وہ کیا اٹھائے ہجر میں صدمے ملال کے — جس ناتواں سے لطف نہ اُٹھیں وصال کے

○

[illegible] ہیں جو مسیحا کہیں مجھ کو ملتے — درد دل کی بھی تمھیں کوئی دوا آتی ہے

○

بجلی کی طرح پھرتی تھی محفل میں کوندتی — کیا کہیے وہ نگاہ کدھر تھی کدھر نہ تھی

○

لاکھ بار اُٹھتا ہے پر جاتا نہیں — درد شاید میرے دل میں قید ہے

○

دردِ بلبل خدا نہ سنوائے — ہائے گل کی صدا نہ سنوائے

○

ہستی و نیستی کا کھلتا نہیں ہے عقدہ — آتے ہیں کچھ ادھر سے جاتے ہیں کچھ ادھر سے

○

صبر آتا ہے نہ مجھ کو نہ اسے آتا ہے — دل کو سمجھاتا ہوں میں دل مجھے سمجھاتا ہے

○

اک کنارے پڑا ہوا ہے امیرؔ — کچھ تمہارا غریب لیتا ہے

○

مسکرایا وہ اس ادا سے امیرؔ — میں تو سمجھا کہ اب گری بجلی

○

کیا مجھی کو دیکھ کر حیرت ہوئی — دیکھو آئینہ کی کیا صورت ہوئی

○

مکاں سے سوئے لامکاں لے گئی — یہ وحشت کہاں سے کہاں لے گئی

○

کوئی امیرؔ ترا درد دل سنے کیونکر — تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

○

چڑھ کے منبر پہ ہجوِ مے واعظ! — اور جو سن لے کوئی خراباتی

○

تو وہ بت ہے کہ جسے ساری خدائی چاہے — بندہ اللہ سے کس کس کی برائی چاہے

○

پوچھا نہ جنسِ دل کو بازار میں کسی نے — سو بار لے گئے ہم سو بار پھیر لائے

○

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے یہ — شمع کی سرگزشت کون سنے

○

میرے مرنے پہ روتی ہے حسرت — عشق بھی مرگِ نوجوانی ہے

○

دو دن کی یا دھر ہی ہے گر فرق ہے تو اتنا — تقدیر بنادی ہے تدبیر بتا دی ہے

○

انسان چاہتا ہے کہ نہ ہو اس کو کبھی رنج — زنہار کسی سے کوئی امید نہ رکھے

○

عجب بےخودی ہے خبر کچھ نہیں — کہاں سے ہم آئے کہاں جائیں گے

○

نہ رہنے نہ جانے کی ہم کو خبر ہے — یہ کیسی اقامت یہ کیسا سفر ہے

○

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی — کاروانِ عمر گزرا آگ باقی رہ گئی

○

جانِ سمندرو دلِ پروانہ دے مجھے — اے سوزِ عشق ہمتِ مردانہ دے مجھے

○

جاری ہے عین دین پہ رسمِ زمانہ ہے — دریا کا ابر، ابر کا دریا خزانہ ہے

○

پردہ الٹ کے جب وہ دیدار عام کرتے — ایوب صبر کرتے تو ہم سلام کرتے

○

بتوں کی روش کوئی کیا جانتا ہے — بڑے بے وفا ہیں خدا جانتا ہے

○

عجب دلچسپ نقشہ عالم ایجاد رکھتا ہے — جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اسے دل یاد رکھتا ہے

○

دل بے آرزو بھی دے تو ہے لطف — یوں تو سب کچھ دیا خدا نے مجھے

○

؎ دل نے اسے دیکھا تو نصیحت کیسی — الٹی کہنے لگے اب اس سے سفارش میری

○

کیا جانیے کہاں لے گئی اس بُت کی تمنّا — اب آپ میں آنا بھی مجھے دشوار ہوا ہے

قدر مرنے کی ہم سمجھتے ہیں   صدمے جھیلے ہیں زندگانی کے

عاشق و معشوق دونوں تیرے دیوانے ہیں یار
دامنِ یوسف گریبانِ زلیخا چاک ہے

دشمنوں کا شکوہ کرتے ہیں حضورِ دوستاں
دوست جب دشمن ہو پھر کس سے شکایت کیجئے

آئینہ کی آنکھ سے ڈرتی ہے جب عاشق کی آنکھ
چاہتی ہے چھین لے لذّت ترے دیدار کی

تمام عمر اُسے دیکھتا رہا ہوں مگر
ہنوز حسرتِ دیدارِ یار باقی ہے

والئ رامپور یوسف علی خان ناظمؔ کی غزل پر تضمین

کیا کیجیے وہ کہتے ہیں ہر بات پر غلط
اظہارِ غم کیا تو کہا سر بسر غلط
یہ دردِ دل در یغ یہ زخمِ جگر غلط
میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

طوفانِ جوشِ گریۂ بے اختیار جھوٹ
آتش فشانیٔ جگرِ داغ دار جھوٹ
زورِ کمند و جذبِ دلِ بے قرار جھوٹ
تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعائے سحر غلط

ہر روز اک تازہ دکھاتے ہیں ماجرا
ہر وقت چھوڑتے ہیں شگوفہ کوئی نیا
جب آزمائیے تو نہ یہ سچ نہ وہ بجا
سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

ہاں داستانِ شکوۂ بختِ زبوں دروغ — ہاں دل کے پیچ و تاب سے سوزِ جنوں دروغ
ہاں فرطِ غم سے جوششِ سیلابِ خوں دروغ — ہاں سینے سے نمائشِ داغِ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے ترادشِ خونِ جگر غلط

صاحب کہو وہ بات کہ ہو کچھ تو دلنشیں — جس کا نہ سر نہ پاؤں ہو اس کا ہو کیا یقیں
اس جھوٹ کی ہے بندہ نواز انتہا کہیں — سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں
ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے ان کی لم غلط

مطلب یہ ہے کہ لوگ کہیں لو وہ مر گیا — بیڑے ہیں عاشقوں کے عجب کام کر گیا
رہ بیٹھیں آشنا کہ وہ جی سے گزر گیا — ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اڑائی خبر غلط

اس بے وفا کو عشق جتانے سے کیا ملا — الزام اٹھائے بیٹھے بٹھائے ہزار ہا
کہتا نہ تھا امیر کہ اظہار ہے برا — یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط

ترکیب بند در تہنیت عید الفطر

جب تک کہ جرمِ شمس و قمر میں ضیا رہے
جب تک فروغِ زہرہ و نورِ سہا رہے
جب تک جہاں میں چار عناصر کی جا رہے
جب تک کہ خاک و آتش و آب و ہوا رہے
مثلِ زمیں سپہر ترے زیرِ پا رہے
سر پہ مدام سایۂ دستِ خدا رہے
جب تک کہ عشقِ گل سے ہے بلبل کے دل میں داغ
جب تک ہے فاختہ کو تمنائے سرو و باغ
پروانہ جب تلک کہ رہے عاشقِ چراغ
آشفتہ عشق مہ سے ہے تا کبک کا دماغ
عارض پہ جانِ جن و بشر کی فدا رہے
دل دو جہاں کا تشنۂ زلفِ دوتا رہے

ایسا جہاں میں حکم کا سکّہ بٹھا دیا
نوشیرواں کا عدل دوبارہ دکھا دیا
اس درجہ گنجِ گوہر و سیم و طلا دیا
نامِ جم و سکندر و دارا مٹا دیا

خورشید تُو تو سب ترے آگے سہا رہے
نام اوروں کا نام کو رہے بھی تو کیا رہے

رباعیات

گھر کھُدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے[1]
ملتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

شہرے کرم پیرِ خرابات کے ہیں
جلسے وہیں رندانِ خوش اوقات کے ہیں
منکر تھے مگر یہ ذکر سنتے سنتے
زہّاد بھی مشتاق ملاقات کے ہیں

خواہانِ طرب ہے جسے ادراک نہیں
آرام تہِ گنبدِ افلاک نہیں
پیمانۂ گردوں میں کہاں بادۂ عیش
جز دردِ تہِ جام یہاں خاک نہیں

ظاہر میں جو آزردہ تمہیں پاتا ہوں
کچھ دل میں نہیں دل کو یہ سمجھاتا ہوں
ہوتا ہے کبھی اگلی محبت کا اثر؟
سچ کہدو کبھی میں تمہیں یاد آتا ہوں

---

[1] غدر ۱۸۵۷ء کا ذکر ہے جب سب گھر بار تباہ ہوگیا۔

تاریخِ وفات

شیخ محمد وحید الزماں صاحب سفیر ریاست رامپور

اللہ نے جو وصف عطا ان کو کیے تھے
وہ آ نہیں سکتے ہیں قیاسِ بشری میں
رحلت کی امیر ان کی کہی میں نے یہ تاریخ
باللہ ملک تھے وہ لباسِ بشری میں
